www.cpsglobal.org

الرسالہ

Al-Risala

November 2009 • No. 396

دوسروں کی شکایت صرف اپنی نااہلی کا اعلان ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ

جاری کردہ 1976

نومبر 2009

فہرست

ایک آیت	2	فخر اور نفرت	27
بے خوفی کی نفسیات	3	مسلمان عالمی محاصرہ میں	28
جنت یا جہانِ لذت	4	شریعتِ محمدی کا نفاذ	29
عقل اور دین	5	ارتقاء یا مغالطہ	30
اعلیٰ معرفت	6	تاریخ کے تین دور	31
معرفت کا سفر	7	اصلاحِ نصاب، یا اصلاحِ ماحول	32
خدا کا وجود	8	ہر گھر بگاڑ کا کارخانہ	34
موت سے پہلے، موت کے بعد	9	خدا کا اعتراف نہیں	35
نماز اور قرآن	10	بچوں کا قبرستان	36
تکفیر یا تبلیغ	13	بحران کا مثبت پہلو	37
ایک اجتماعی ضرورت	14	انفرادی آداب، اجتماعی آداب	38
فطرت کا نظام	15	حرص، قناعت	39
بے اعترافی کا مزاج	16	خیر خواہی یا بد خواہی	40
ردّ عمل، انتہا پسندی	17	سوال و جواب	41
شکایت کا مزاج	18	خبر نامہ اسلامی مرکز	43
دو عظیم فکری انقلابات	19		
تباہ کن غلط فہمی	26		

اردو اور انگریزی میں شائع ہونے والا

اسلامی مرکز کا ترجمان

زیر سرپرستی

مولانا وحید الدین خاں

صدر اسلامی مرکز

Al-Risala Monthly

1, Nizamuddin West Market
New Delhi-110 013
Tel. 24356666, 24355454
Fax: 24357333
www.goodwordbooks.com
email: info@goodwordbooks.com

Subscription Rates
Single copy Rs. 10
One year Rs. 100
Two years Rs. 200
Three years Rs. 300
Four years Rs. 400
Five years Rs. 450
Abroad by Air Mail. One year $20

Printed and published by Saniyasnain Khan on behalf of Al-Markazul Islami, New Delhi.

Printed at Nice Printing Press, 7/10, Parwana Road, Khureji Khas, Delhi-110 051

ایک آیت

قرآن کی سورہ نمبر 4 میں ارشاد ہوا ہے: وإن مّن أهل الكتاب إلاَّ ليؤمننّ به قبل موته (النساء: 159) یعنی اہل کتاب میں سے کوئی شخص ایسا نہیں ہے جو اپنی موت سے پہلے اس (قرآن) پر ایمان نہ لے آئے۔

اِس آیت میں ایک متعین حوالہ (particular reference) کی روشنی میں ایک عمومی (general) بات کہی گئی ہے، وہ یہ کہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی ایک سچائی کا انکار کرتا رہتا ہے، لیکن اپنے آخری زمانے میں جب کہ وہ اپنی موت کے قریب پہنچ جاتا ہے، اُس وقت وہ محسوس کرتا ہے کہ میرا انکار درست نہ تھا۔ آخر وقت میں اُس کا دل اُس بات کو داخلی طور پر مان لیتا ہے جس کا وہ اپنی پوری زندگی میں انکار کرتا رہا۔

اِس کا سبب یہ ہے کہ سچائی اپنی حقیقت کے اعتبار سے ہر آدمی کے دل کی آواز ہوتی ہے۔ وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر اس کی صداقت کو محسوس کرتا رہتا ہے۔ لیکن جوانی کی عمر میں اس کو اپنے اوپر اتنا زیادہ اعتماد رہتا ہے کہ وہ سچائی کے معاملے پر غور کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ وہ سمجھتا رہتا ہے کہ میرا راستہ درست راستہ ہے۔ وہ اپنی بڑائی کو باقی رکھنے کے لیے سچائی کا اعتراف کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔

لیکن جب اُس پر بڑھاپا آتا ہے، جب وہ ذہنی اور جسمانی کم زوری کا شکار ہو جاتا ہے، جب وہ دیکھتا ہے کہ جلد ہی میری موت آنے والی ہے، اُس وقت حالات کے اثر سے اس کے اندر نظر ثانی کا مزاج پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کی دبی ہوئی فطرت ابھر آتی ہے۔ وہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ سچائی وہی تھی جس کا میں انکار کرتا رہا، لیکن عزتِ نفس (self-respect) کا خیال اس کو اس سے روک دیتا ہے کہ وہ کھلے طور پر اپنی غلطی کا اعتراف کرے۔ رشید کوثر فاروقی (وفات: 2007) نے اپنے ایک شعر میں اِس حقیقت کا اعتراف اِن الفاظ میں کیا ہے:

زیست کا راز کھلا، گردشِ ایام کے بعد　　اِس کہانی کا تو آغاز تھا، انجام کے بعد

بے خوفی کی نفسیات

آج کل مسلمانوں میں ہر جگہ اسلام کی دھوم ہے۔ مشرق سے مغرب تک ہر جگہ دین کے نام پر بے شمار سرگرمیاں جاری ہیں۔ مگر اِن ہنگامہ خیز سرگرمیوں میں وہی چیز غائب ہے جو دین کی اصل ہے، یعنی اللہ کا خوف جس کو قرآن اور حدیث میں تقویٰ کہا گیا ہے۔

آج کل مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ اگر اُنھیں قیامت کی خبر دی جائے تو وہ ایسا جواب دیں گے، جیسے کہ انھیں قیامت کے آنے کا کوئی ڈر نہیں، اس لیے کہ ان کو ''شفیع المذنبین'' کا وسیلہ حاصل ہے۔ قیامت اگر آئی بھی تو وہ صرف دوسروں کے لیے ہوگی، نہ کہ مسلمانوں کے لیے۔

مسلمانوں کو قیامت سے ڈرایئے تو اُن میں سے کوئی شخص کہے گا کہ ابھی قیامت کہاں، ابھی تو مسیح نازل نہیں ہوئے۔ ابھی تو مہدی نہیں آئے۔ ابھی تو دجال ظاہر نہیں ہوا۔ کوئی کہے گا کہ حدیث میں آیا ہے: **مَن مات فقد قامت قیامته**۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ انفرادی قیامت تو ہر روز آرہی ہے۔ اِسی طرح ایک دن اجتماعی قیامت بھی آجائے گی، پھر اس کے بارے میں فکرمند ہونے کے کیا معنیٰ۔ کوئی کہے گا کہ دنیا اور آخرت کی تمام سعادتیں مسلمانوں کے لیے لکھ دی گئی ہیں، پھر ایسی حالت میں قیامت سے ڈرنے کی کیا ضرورت، وغیرہ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **بعثتُ أنا و الساعة جمیعًا** (مسند احمد، جلد 5، صفحہ 348) یعنی میں اور قیامت دونوں ساتھ ساتھ بھیجے گئے ہیں۔ اِس کو سن کر اصحابِ رسول کا یہ حال ہوا کہ اگر آندھی بھی آجاتی تو وہ ڈر جاتے کہ شاید قیامت آگئی۔ مگر آج کل مسلمانوں کی بے خوفی کا یہ حال ہے کہ اُن سے کچھ بھی کہیے، لیکن ان کے اندر ڈر کی نفسیات نہیں پیدا ہوگی، وہ بدستور بے خوفی کی زندگی گزارتے رہیں گے۔ یہ حالت صرف عام مسلمانوں کی نہیں ہے، بلکہ ان لوگوں کی بھی یہی حالت ہے جن کی ظاہری وضع قطع کو دیکھ کر ان کو دین دار مسلمان ہونے کا لقب دیا جاتا ہے۔ یہ گراوٹ کا آخری درجہ ہے، اس کے بعد گراوٹ کا کوئی اور درجہ نہیں۔

جنت یا جہانِ لذت

قرآن کی سورہ نمبر 14 میں دنیا کے بارے میں یہ الفاظ آئے ہیں: وآتاکم من کلّ ما سألتموہ (إبراهيم: 34) اِس کے مقابلے میں، جنت کے بارے میں قرآن کی سورہ نمبر 42 میں یہ الفاظ آئے ہیں: ولكم فيها ما تشتهي أنفسكم (حم السجدة: 31) اِن دونوں آیتوں پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ دنیا میں انسان کو تمام چیزیں بقدرِ ضرورت دی گئی ہیں۔ اِس کے مقابلے میں جنت میں انسان کو تمام چیزیں بقدر خواہش دی جائیں گی۔

انسان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ایک لذت طلب حیوان (pleasure-seeking animal) ہے۔ لذت ایک انوکھی صفت ہے جو صرف انسان کے اندر پائی جاتی ہے۔ انسان کے اندر ہر قسم کی لذتوں کی بے پناہ طلب موجود ہے۔ لیکن موجودہ دنیا میں کسی بھی عورت یا مرد کی خواہشیں پوری نہیں ہوتیں۔ ہر ایک کے ساتھ یہ ہوتا ہے کہ وہ کامل فُل فِل مینٹ (fulfilment) کے حصول کے بغیر مر کر اِس دنیا سے چلا جاتا ہے، خواہ وہ امیر ہو یا غریب، خواہ وہ عالم ہو یا جاہل، خواہ وہ عام انسان ہو یا کوئی بادشاہ۔

انسان کی لذتوں کی فہرست بہت لمبی ہے — لذتِ فکر، لذتِ بصارت، لذت سماعت، لذتِ ذائقہ، لذتِ لمس، لذتِ گفتگو، لذتِ رفاقت، لذتِ مطالعہ، لذتِ دریافت، لذتِ مسرت، وغیرہ۔ اِن تمام لذتوں کی طلب انسان کے اندر بے پناہ حد تک موجود ہے، لیکن موجودہ دنیا میں انسان اپنی اِن لذتوں کی تکمیل نہیں کر پاتا۔ وہ اِسی کی تلاش میں رہتا ہے، مگر بہت جلد اس کو موت آجاتی ہے۔ موجودہ دنیا میں اُس کو احساسِ لذت کا تجربہ تو ہوتا ہے، لیکن تکمیلِ لذت کا تجربہ اس کو حاصل نہیں ہوتا۔

ایک ملحد فلسفی نے جنت کو ''خوش خیالی'' قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ جنت انسانی تمناؤں کی خوب صورت تخئیل (beautiful idealization of human wishes) ہے۔ مگر زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ جنت انسان کی خوب صورت تمناؤں کا پوری طرح وقوع میں آنا (beautiful actualization of human wishes) ہے۔

عقل اور دین

قرآن کی سورہ نمبر 38 میں قرآن کے بارے میں یہ آیت آئی ہے: **كتابٌ أنزلناه إليك مبارك ليدّبّروا آياته وليتذكر أولوا الألباب** (ص: 29) یعنی یہ ایک مبارک کتاب ہے جو ہم نے تمھاری طرف اتاری ہے، تاکہ لوگ اس کی آیتوں پر غور کریں اور تاکہ عقل والے اس سے نصیحت حاصل کریں۔

اِس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن لفظی تلاوت (recitation) کے لیے نہیں ہے، بلکہ وہ اِس لیے ہے کہ پڑھنے والا اپنی عقل کو استعمال کرتے ہوئے اس کی آیتوں پر غور کرے اور اُس سے وہ نصیحت حاصل کرے جو آیتوں کے اندر چھپی ہوئی ہے۔

عقل کی اہمیت کے بارے میں پیغمبر اسلام ﷺ کی بہت سی روایتیں آئی ہیں۔ اِن میں سے ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں: **لكلّ شيئ دِعامة، ودعامة المؤمن عقله** (مسند الحارث للهيثمي، رقم الحديث: 840) یعنی ہر چیز کا ایک ستون ہوتا ہے، اور مومن کا ستون اس کی عقل ہے۔

اِس معاملے کی وضاحت ایک اور حدیث سے ہوتی ہے۔ ایک روایت کے مطابق، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کے بارے میں فرمایا کہ قرآن کی ہر آیت کا ایک ظاہر ہے اور ایک اس کا باطن ہے (**لكل آية منها ظهر وبطن**)۔

قرآن کی آیتوں کا ظاہری مفہوم تو اس کی آیتوں کے ترجمے سے معلوم ہو جاتا ہے، لیکن آیتوں کا جو باطن، یعنی اس کا جو گہرا مفہوم ہے، وہ صرف عقل کے استعمال کے ذریعے ہی معلوم ہوتا ہے۔ عقل کے ذریعے آدمی الفاظ پر مزید غور وفکر کرتا ہے۔ اِس غور وفکر کے ذریعے وہ آیتوں کے اندر چھپے ہوئے گہرے معانی تک پہنچتا ہے۔ قرآن کی یہ گہری معرفت ہی آدمی کے اندر اعلیٰ ایمانی کیفیت پیدا کرتی ہے — عقل کے استعمال کے بغیر کسی آدمی کو جو دین حاصل ہوتا ہے، وہ دین کا چھلکا ہے اور عقل کے استعمال کے بعد کسی آدمی کو جو دین حاصل ہوتا ہے، وہ دین کا مغز ہے۔

اعلیٰ معرفت

اعلیٰ معرفت بلا شبہہ کسی انسان کا سب سے بڑا سرمایہ ہے۔ یہ دراصل اعلیٰ معرفت ہے جو انسان کو حیوان سے ممیّز کرتی ہے۔ اعلیٰ معرفت کو حاصل کرنا، اتنا ہی ممکن ہے جتنا کہ کسی اور چیز کو حاصل کرنا۔ شرط صرف یہ ہے کہ آدمی اس کی قیمت ادا کرے۔ ضروری قیمت ادا کئے بغیر اِس دنیا میں کوئی چیز کسی کو نہیں ملتی، اور اِسی طرح اعلیٰ معرفت بھی۔

اعلیٰ معرفت کے حصول کی قیمت کیا ہے، وہ صرف ایک ہے— معرفت کو اپنی زندگی میں اوّلین درجہ دینا اور بقیہ تمام چیزوں کو ثانوی بنا دینا۔ جو عورت یا مرد یہ قیمت ادا کریں، وہ ضرور اعلیٰ معرفت کے درجے تک پہنچیں گے۔ اور جو لوگ یہ قیمت ادا نہ کریں، وہ کسی بھی حال میں اعلیٰ معرفت کے درجے تک نہیں پہنچ سکتے، خواہ کسی اور اعتبار سے انھوں نے کتنا ہی زیادہ عمل کیا ہو۔

اصل یہ ہے کہ زندگی میں بار بار ایسے مواقع آتے ہیں، جب کہ آدمی اپنے آپ کو دو تقاضوں کے درمیان پاتا ہے، دین کا تقاضا اور دنیا کا تقاضا۔ ایسے موقع پر آدمی اگر یہ کرے کہ وہ دین کے تقاضے کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے دنیوی تقاضے کی طرف جھک جائے، تو ایک بار ایسا کرنا بھی آدمی کے لیے ہلاکت کا سبب بن جاتا ہے۔

اِس طرح شیطان کو یہ موقع مل جاتا ہے کہ وہ آدمی کے سفرِ معرفت کو روک کر اس کو پیچھے کی طرف دھکیل دے۔ یہی وہ حقیقت ہے جو قرآن میں اِس طرح بیان کی گئی ہے:

''جو لوگ ڈر رکھتے ہیں، جب کبھی اُنھیں کوئی شیطانی خیال چھو جاتا ہے تو وہ فوراً چونک پڑتے ہیں، اور پھر اُسی وقت اُن کو سوجھ آجاتی ہے۔ اور جو شیطان کے بھائی ہیں، وہ اُن کو گم راہی میں کھینچے چلے جاتے ہیں، پھر وہ کمی نہیں کرتے۔'' (الأعراف: 202-201)

حقیقت یہ ہے کہ معرفت کا سفر ایک مسلسل سفر ہے۔ ایک دن کے لیے بھی اگر آدمی نے اپنے سفرِ معرفت کو روکا تو وہ سالوں کے لیے پیچھے چلا جائے گا۔

معرفت کا سفر

گورنمنٹ سروس میں ایک ضابطہ ہے جس کو بریک اِن سروس (break in service) کہا جاتا ہے۔ اگر آپ گورنمنٹ سروس میں ہوں اور آپ بیس سال تک سروس کرتے رہیں، اِس کے بعد اچانک آپ بلا سبب اور بلا اجازت ڈیوٹی پر نہ آئیں تو آپ کی ساری سینئرٹی (seniority) ختم ہوجائے گی۔ آپ پیچھے لوٹ کر دوبارہ وہاں پہنچ جائیں گے، جہاں سے آپ نے سروس شروع کی تھی۔ اِس معاملے کو اصطلاح میں بریک ان سروس کہا جاتا ہے۔

یہی معاملہ معرفت (realization of God) کے سفر کا بھی ہے۔ اگر آپ معرفت کا سفر شروع کریں اور ایک مدت تک آپ مسلسل اُس پر چلتے رہیں، پھر آپ ایک عذر (excuse) لے کر وقتی طور پر معرفت کے سفر کو روک دیں، تو یہ رکنا صرف ایک وقتی رکنا نہ ہوگا، بلکہ وہ بریک اِن معرفت کے ہم معنیٰ بن جائے گا، یعنی آپ پیچھے لوٹ کر دوبارہ اُس ابتدائی مقام پر پہنچ جائیں گے جہاں سے آپ نے اپنا سفرِ معرفت شروع کیا تھا۔

آدمی پر حقیقت کھلتی ہے اور وہ معرفت کا مسافر بن جاتا ہے، پھر درمیان میں کچھ غیر متعلق تقاضے پیش آتے ہیں جن کو عذر بنا کر آدمی اپنے سفرِ معرفت کو روک دیتا ہے۔ مثلاً خاندانی تقاضا، مادّی منفعت کا تقاضا، ذاتی رجحان کا تقاضا، وغیرہ۔

ایسے موقع پر آدمی کو چاہئے کہ وہ اِس قسم کے کسی تقاضے کو ہرگز اپنے لیے عذر نہ بنائے۔ وہ دوسرے تمام تقاضوں کو نظر انداز کرتے ہوئے معرفت کے سفر کو جاری رکھے۔ ایسا ہی شخص منزل تک پہنچے گا۔ اور جس آدمی نے کسی غیر متعلق تقاضے کو لے کر اس کو اپنے لیے عذر بنالیا تو وہ اُس کے لیے بریک اِن معرفت کا واقعہ بن جائے گا۔

یہ ایک نہایت سنگین معاملہ ہے۔ معرفتِ حق کے مسافر کو ایسی غلطی کبھی نہیں کرنا چاہیے، ورنہ وہ ایسے نقصان سے دوچار ہوگا جس کی تلافی دوبارہ ممکن نہیں۔

خدا کا وجود

پچھلے تقریباً پانچ سو سال سے کائنات کا سائنسی مطالعہ جاری ہے۔ اِس مطالعے میں بڑے بڑے دماغ شامل رہے ہیں۔ آخری بات جہاں یہ سائنسی مطالعہ پہنچا ہے، وہ یہ ہے کہ کائنات اتنی زیادہ وسیع ہے کہ انسان کے لیے اُس کو اپنے احاطے میں لانا بظاہر ناممکن ہے۔ تازہ ترین سائنسی تحقیق کے مطابق، انسان کا علم بہ مشکل کائنات کے صرف پانچ فی صد حصے تک پہنچا ہے۔ اِس پانچ فی صد حصے کے معاملے میں بھی انسانی علم کی محدودیت کا یہ عالم ہے کہ ایک سائنس داں نے کہا کہ ہم جتنا دریافت کر پاتے ہیں، اُس سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ دریافت شدہ چیزیں بھی ابھی تک غیر دریافت شدہ چیزوں کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ہمارا حال یہ ہے کہ ہم کم سے کم کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جان رہے ہیں:

We are knowing more and more about less and less.

خدا کے بارے میں جاننا خالق (Creator) کے بارے میں جاننا ہے۔ مگر تجربہ بتاتا ہے کہ ابھی تک انسان خالق کی تخلیق (creation) کے بارے میں بھی صرف چند فی صد جان سکا ہے۔ ایسی حالت میں کسی انسان کا یہ مطالبہ کرنا کہ خالق کے بارے میں ہم کو قطعی معلومات دو، سرتاسر ایک غیر علمی مطالبے کی حیثیت رکھتا ہے۔ جب انسان کا حال یہ ہے کہ وہ ابھی تک تخلیق کے بارے میں پورا علم حاصل نہ کر سکا تو وہ خالق کے بارے میں پورا علم کیسے حاصل کر سکتا ہے۔

تخلیق کا وجود زمان ومکان (space and time) کے اندر ہے، اور خالق کا وجود ماورائے زمان ومکان (beyond space and time) سے تعلق رکھتا ہے، پھر جو انسان اتنا محدود ہو کہ وہ زمان ومکان کے اندر کی چیزوں کا بھی احاطہ نہ کر سکے، وہ زمان ومکان کے باہر کی حقیقت کو اپنے احاطے میں کس طرح لا سکتا ہے— حقیقت یہ ہے کہ اِس دنیا میں انسان خدا کو صرف عجز کی سطح پر دریافت کر سکتا ہے، نہ کہ علم کی سطح پر۔

موت سے پہلے، موت کے بعد

پوری انسانی تاریخ میں انسان جس سب سے بڑی فراموشی میں مبتلا رہا ہے، وہ صرف ایک ہے، اور وہ موت کا معاملہ ہے۔ اِس معاملے میں انسان کی غفلت کا یہ عالم ہے کہ مشکل سے چند ایسے افراد دریافت کیے جاسکتے ہیں جو اِس معاملے میں فراموشی کا شکار نہ ہوں۔

موجودہ دنیا دار الامتحان (testing ground) ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ موجودہ دنیا میں انسان کو جو کچھ ملا ہوا ہے، وہ سب کا سب سامانِ امتحان کے طور پر ملا ہوا ہے۔ موت اِس مدتِ امتحان کو ختم کرتی ہے۔ اِس لیے موت کے آتے ہی ہر انسان سے وہ تمام چیزیں اچانک چھن جائیں گی جو اُس کو یہاں امتحان کے طور پر ملی ہوئی تھی۔

موت کے بعد آدمی اچانک ایک نئی دنیا میں داخل ہوجاتا ہے۔ یہ دنیا اپنے عمل کے نتائج پانے کی دنیا ہے۔ موت سے پہلے آدمی اگر سامانِ امتحان میں جی رہا تھا تو موت کے بعد اُس کو اپنے عمل کے نتائج کے درمیان جینا پڑے گا۔ موت سے پہلے کی زندگی عارضی زندگی ہے، یعنی بہ مشکل سو سال، لیکن موت کے بعد کی زندگی ابدی زندگی ہے، اُس کا کبھی خاتمہ ہونے والا نہیں۔

موت سے پہلے کی زندگی میں انسان کو بے شمار چیزیں ملی ہوئی ہیں۔ یہ تمام چیزیں پیدا ہوتے ہی اُس کو اپنے آپ حاصل ہوجاتی ہیں۔ اِس لیے آدمی اِن چیزوں کو فار گرانٹیڈ (for granted) طور پر لیتا رہتا ہے۔ وہ سوچ نہیں پاتا کہ یہ تمام عطیات اچانک اس سے منقطع ہوجائیں گے۔ موت کے بعد آدمی اچانک اپنے آپ کو اِس حال میں پائے گا کہ وہ بالکل تنہا اور بے سہارا ہوگیا۔

اِس سنگین حقیقت کے بارے میں سوچنا انسان کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ لیکن آدمی بے فکری کی حالت میں پڑا رہتا ہے، یہاں تک کہ وہ اچانک مرکر اِس دنیا سے چلا جاتا ہے۔ وہ اِس حدیث رسول کا مصداق بن جاتا ہے: **ما رأیتُ مثلَ النار نام هاربها، وما رأیت مثل الجنة نام طالبها (الترمذی، کتاب صفة جهنم)۔**

نماز اور قرآن

اسلوبِ کلام کی دو قسمیں ہیں — دعوتی اسلوب اور قانونی اسلوب۔ دعوتی اسلوب میں صرف بنیادی باتیں اصولی زبان میں بیان کی جاتی ہیں۔ اس کے برعکس، قانونی اسلوب میں محدّد اور متعین زبان (specific language) استعمال ہوتی ہے۔ قرآن اور حدیث کے درمیان یہی فرق ہے۔ قرآن میں عام طور پر دعوتی اسلوب ہے۔ اور حدیث میں دعوتی اسلوب کے علاوہ، قانونی اسلوب بھی پایا جاتا ہے۔ مثلاً نماز کے بارے میں قرآن میں حافظوا علی الصلوات کا لفظ آیا ہے۔ اور حدیث میں تعین کے ساتھ الصلوات الخمس (صحیح البخاری، کتاب الإیمان) کا لفظ استعمال ہوا ہے۔

قرآن میں دین کے تمام اصول (principles) بیان کیے گئے ہیں، لیکن قرآن میں کسی بھی اصول کو محدّد اسلوب میں بیان نہیں کیا گیا ہے۔ مثلاً قرآن میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو پیغمبر بنانے کا ذکر ہے، لیکن قرآن سے معلوم نہیں ہوتا کہ آپ کو یہ پیغمبری کب دی گئی۔ قرآن میں ہجرت کا حکم موجود ہے، لیکن مکہ میں دعوتی کام کس طرح ہوا اور مدینہ میں دعوتی کام کس طرح ہوا، اس کی کوئی تفصیل قرآن میں موجود نہیں۔ قرآن میں فتحِ مبین (الفتح: 1) کا ذکر ہے، لیکن قرآن میں فتحِ مبین کی متعین تفصیل موجود نہیں۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ لوگ فوج در فوج خدا کے دین میں داخل ہوں گے (النصر: 2) لیکن تعینات کی زبان میں اس کا کوئی ذکر قرآن میں موجود نہیں، وغیرہ۔ ان تمام چیزوں کی تفصیل صرف حدیث سے معلوم ہوتی ہے، نہ کہ قرآن سے۔

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ انسان کو صرف عبادتِ الٰہی کے لیے پیدا کیا گیا ہے (الذاریات: 56) یہ بلاشبہہ انسانی زندگی کے مقصد کو جاننے کے اعتبار سے نہایت اہم آیت ہے، لیکن عبادت کے متعین طریقے کیا ہوں، اِس کا علم صرف حدیث سے ہوتا ہے، نہ کہ قرآن سے۔

یہی معاملہ نماز کا ہے۔ قرآن میں نماز کا بنیادی حکم موجود ہے، مثلاً أقم الصلاة لذکری (طٰہٰ: 14) تاہم جہاں تک نماز کی محدّد تفصیلات کا معاملہ ہے، وہ قرآن کے عام اصول کے

مطابق، قرآن میں موجود نہیں، البتہ حدیث میں اس کی تفصیلات موجود ہیں۔

اِس پہلو سے قرآن کا مطالعہ کیجئے تو معلوم ہوگا کہ نماز کے تمام بنیادی اَجزا قرآن میں مذکور ہیں۔ مثلاً قرأت (الإسراء: 78) قیام (المزّمل: 20)، رکوع (البقرة: 43)، سجدہ (البقرة: 125)، جماعت کے ساتھ نماز (البقرة: 43)، وغیرہ۔ اب یہ سوال ہے کہ اِن اجزاءِ نماز کی مجموعی صورت کیا ہے۔ جب آپ اِن اجزا کو لے کر نماز کی مجموعی شکل بنانا چاہیں تو آپ نماز کی موجودہ شکل کے سوا کوئی اور شکل نہیں بنا سکتے۔ یہ ایک عجیب بات ہے کہ خدا کی پیدا کی ہوئی دنیا میں ہر چیز اپنے فائنل ماڈل پر ہے۔ اِسی طرح نماز بھی اپنے فائنل ماڈل پر ہے۔ یہی واقعہ اِس بات کے ثبوت کے لیے کافی ہے کہ نماز کے جو اجزا قرآن میں بتائے گئے ہیں، ان کی مجموعی شکل موجودہ نماز کے سوا کوئی اور نہیں ہوسکتی۔

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ پانچ وقت کی نماز کا حکم استنباطی طور پر قرآن میں موجود ہے۔ یہ حکم قرآن کی سورہ نمبر 2 کی اِس آیت میں ملتا ہے: حافظوا علی الصلوات والصلاة الوسطیٰ (البقرة: 238) یعنی نمازوں کی پابندی کرو، اور بیچ کی نماز کی۔ اِس آیت میں ''صلوات'' کا لفظ آیا ہے۔ عربی قاعدے کے مطابق، صلوات کا اطلاق تین یا اس سے زیادہ عدد پر ہوتا ہے، اس کو دو کے معنی میں نہیں لیا جاسکتا۔ اس کو تین یا تین سے زیادہ کے معنی ہی میں لینا ممکن ہے۔

آیت کے الفاظ کے مطابق، اُس کا مفہوم یہ بنتا ہے کہ — تم نمازوں کی پابندی کرو، اور اُس نماز کی پابندی کرو جو اِن نمازوں کے درمیان میں آتی ہے۔ اب اگر صلوات سے صرف تین نمازیں مراد لی جائیں تو ایسی صورت میں ان کی کوئی درمیانی نماز نہیں بنے گی، کیوں کہ تین نمازوں کی صورت میں ایک طرف ایک نماز ہوگی اور دوسری طرف دو نماز۔ ایسی حالت میں ممکن صورت صرف یہ ہے کہ صلوات سے چار نمازیں مراد لی جائیں۔ اِس سے چار نماز مراد لینے کی صورت میں ایسا ممکن ہوجاتا ہے کہ اُن میں ایک اور نماز اِس طرح شامل کی جائے کہ وہ بیچ کی نماز بن جائے۔ ایسی صورت میں بیچ کی نماز کے ایک طرف دو نماز ہوتی ہے، اور دوسری طرف بھی دو نماز — اِس طرح مجموعی طور پر کل پانچ

نمازیں بن جاتی ہیں۔ ذیل میں اِس کا نقشہ ملاحظہ ہو:

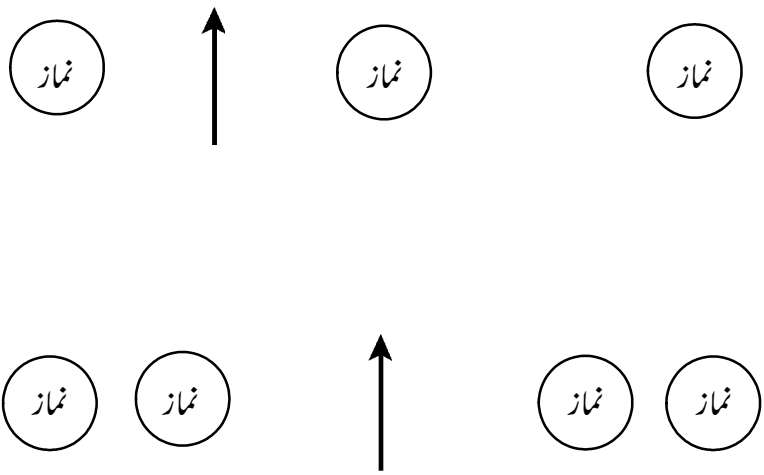

قرآن کی اِس آیت کی یہ تشریح ایک حدیث رسول سے معلوم ہوتی ہے۔ سنن ابی داؤد کی ایک روایت میں بتایا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار ظہر کی نماز پڑھی۔ اور پھر آپ نے فرمایا: **إنّ قبلها صلاتين وبعدها صلاتين (كتاب الصلاة، باب فى وقت صلاة العصر، رقم الحديث** 411) یعنی اِس نماز سے پہلے دو نمازیں ہیں، اور اِس نماز کے بعد دو نمازیں، یعنی ظہر کی نماز بیچ کی نماز ہے۔ اس کے ایک طرف عشاء اور فجر کی دو نمازیں ہیں، اور اس کے دوسری طرف عصر اور مغرب کی دو نمازیں۔ ملاحظہ ہو ذیل کا نقشہ:

تکفیر یا تبلیغ

ایک روایت حدیث کی مختلف کتابوں میں آئی ہے۔ صحیح البخاری کے الفاظ یہ ہیں: **إذا قال الرجل لأخيه يا كافر، فقد باء به أحدهما (كتاب الأدب، باب مَن أكفر أخاه)** یعنی جب ایک شخص اپنے بھائی کے بارے میں کہے کہ اے کافر، تو یہ قول دونوں میں سے کسی ایک کی طرف ضرور لوٹے گا۔ یعنی مخاطب اگر کافر نہ ہو، تو خود قائل خدا کے نزدیک کافر ہو جائے گا۔

صحیح مسلم میں کتاب الایمان کے تحت، اِس معاملے کی وضاحت کرتے ہوئے امام النووی نے لکھا ہے کہ: **واعلم أن مذهب أهل الحق أنه لا يُكفّر أحد من أهل القبلة بذنب** (شرح النووی، جلد 1، صفحہ 150) یعنی اہلِ حق کا یہ مسلک ہے کہ کسی بھی گناہ پر اہلِ قبلہ میں سے کسی شخص کی ہرگز تکفیر نہیں کی جائے گی، یعنی جو شخص کعبہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھے، اس کی تکفیر نہیں کی جائے گی۔

حقیقت یہ ہے کہ کسی انسان کو کافر قرار دینا صرف خدا کا کام ہے، وہ کسی انسان کا کام نہیں۔ ایمان اور کفر دونوں کا تحقق نیت پر ہوتا ہے، اور نیت کا علم خدا کے سوا کسی اور کو نہیں۔ اِس لیے یہ صرف خدا کا کام ہے کہ وہ کسی کے بارے میں کافر یا مومن ہونے کا فیصلہ فرمائے۔ انسان کا کام صرف یہ ہے کہ وہ کسی کو غلطی پر دیکھے تو وہ اس کو دل سوزی کے ساتھ تبلیغ اور نصیحت کرے، وہ اس کی اصلاح کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا کرے۔ تکفیر گویا کہ خدا کے دائرے میں داخل ہونا ہے، اور خدا کے دائرے میں داخل ہونے کا حق کسی کو بھی نہیں۔

جو شخص دوسرے کو کافر بتائے، وہ خود اپنے بارے میں یہ اعلان کر رہا ہے کہ میرے سینے میں لرزاں اور ترساں قلب نہیں۔ جو آدمی حقیقی معنوں میں اللہ سے ڈرتا ہو، وہ کبھی ایسا نہیں کر سکتا کہ وہ کسی کے بارے میں کفر کا اعلان کرے، جب کہ یہ قطعی اندیشہ ہے کہ اگر مخاطب کافر نہ ہو تو خود کہنے والا شخص خدا کے نزدیک کافر قرار پا جائے گا۔ کوئی بھی اللہ سے ڈرنے والا انسان یہ خطرناک رِسک (risk) لینے کا تحمل نہیں کر سکتا۔

ایک اجتماعی ضرورت

حضرت مقدام بن معدیکرب سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **إذا أحبّ الرجلُ أخاه فليخبره أنه يحبّه (أبو داؤد، كتاب الأدب؛ الترمذی، كتاب الزهد)** یعنی جب کسی شخص کو اپنے بھائی سے محبت ہو تو وہ اُس کو بتادے کہ وہ اُس سے محبت کرتا ہے۔

اِس حدیث رسول میں محبت سے مراد مخلصانہ محبت یا حقیقی محبت ہے، نہ کہ منافقانہ محبت۔ مخلصانہ محبت ایک قابلِ اجر عمل ہے، جب کہ منافقانہ محبت صرف ایک گناہ کا عمل۔ منافقانہ محبت کا اظہار آدمی کو مزید گنہ گار بناتا ہے، وہ اس کو اجر کا مستحق نہیں بناتا۔

مخلصانہ محبت یا حقیقی محبت ایک عظیم دینی عمل ہے۔ مخلصانہ محبت کوئی آسان کام نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر ذاتی بنیاد پر دو آدمیوں کے درمیان محبت ہو تو وہ بہت جلد ٹوٹ جاتی ہے۔ مخلصانہ محبت وہ ہے جو خدا کے لیے ہو، اور جب دو آدمیوں کے درمیان خدا کے لیے محبت ہو تو وہ ہمیشہ باقی رہتی ہے، وہ کبھی ٹوٹنے والی نہیں۔

اِس حدیث میں محبت سے مراد محبت اور اُس کے تمام لوازم ہیں۔ مثلاً اعتراف، وغیرہ۔ محبت یا لوازِم محبت کو بتانے کی حکمت یہ ہے کہ اِس سے دو افراد کے درمیان مثبت تعلق قائم ہوتا ہے۔ اگر محبت یا لوازمِ محبت کو نہ بتایا جائے تو اِس سے غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں، اور غلط فہمی جب دیر تک باقی رہے تو وہ پختہ ہو جاتی ہے اور قلبی محبت کے باوجود دونوں فریق ایک دوسرے کے خلاف منفی نفسیات کا شکار ہو جاتے ہیں۔

منافقانہ طور پر اظہارِ محبت یا اظہارِ اعتراف جتنا زیادہ برا ہے، مخلصانہ طور پر اظہارِ محبت یا اظہارِ اعتراف اتنا ہی زیادہ ضروری ہے۔ اِس مسئلے کی اہمیت شرعی نہیں، بلکہ نفسیاتی ہے۔ یہ اجتماعی زندگی کو صالح بنیادوں پر قائم کرنے کے لیے ضروری ہے، کیوں کہ دل کی حالت کا علم صرف خدا کو ہوتا ہے۔ انسان کسی کے دل کو نہیں پڑھ سکتا، وہ صرف بتانے کے بعد ہی اس کو جانتا ہے۔

فطرت کا نظام

حضرت ابو ہریرہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **إنّ الله ليؤيد هذا الدين بالرجل الفاجر (صحيح البخاری، كتاب الجهاد والسير، باب إن الله يؤيّد الدين)** یعنی اللہ بے شک اِس دین کی تائید فاجر شخص کے ذریعے بھی کرے گا۔

اِس حدیث کا تعلق سادہ طور پر صرف دینِ اسلام سے نہیں ہے۔ اِس حدیث میں دراصل فطرت کے ایک قانون کو بتایا گیا ہے۔ یہ قانون ابدی بھی ہے اور ہر ایک کے لیے عام بھی۔

اصل یہ ہے کہ خالق نے اِس دنیا کا نظام باہمی انحصار (interdependence) کے اصول پر قائم کیا ہے۔ اِس دنیا میں ہر انسان بالواسطہ یا براہِ راست طور پر دوسرے انسانوں سے جڑا ہوا ہے۔ جب بھی کوئی شخص ایک کام کرتا ہے تو اس میں یقینی طور پر دوسروں کا بھی حصہ ہوتا ہے۔ اِس دنیا میں ہر کامیابی کا تعلق مشترک عمل سے ہوتا ہے، خواہ وہ دینی کامیابی ہو یا دنیوی کامیابی۔

فطرت کا یہ نظام اِس لیے ہے، تاکہ لوگوں کے اندر ایک دوسرے کے لیے اعتراف کا جذبہ پیدا ہو، تاکہ لوگ ایک دوسرے کو اپنا خیر خواہ سمجھیں، تاکہ پوری دنیا ایک بڑے خاندان کے مانند ہو جائے، تاکہ ہر ایک دوسرے کو اپنے بھائی اور بہن کے روپ میں دیکھنے لگے۔

باہمی تعاون کے اِس عالمی نظام کے باوجود کیوں ایسا ہے کہ لوگوں میں ایک دوسرے کا اعتراف نہیں۔ اِس کا بنیادی سبب لوگوں کی فخر پسندی (pride) ہے۔ ہر عورت اور مرد کا یہ حال ہے کہ وہ فخر میں جی رہے ہیں۔ فخر کے جذبے کی تسکین صرف اُس وقت ہوتی ہے، جب کہ آدمی یہ سمجھے کہ جو کچھ اُس کو ملا ہے، وہ اس کی اپنی ذاتی صلاحیت کی بنیاد پر ملا ہے۔ فخر کا جذبہ اپنی تسکین کے لیے سارا کریڈٹ خود لینا چاہتا ہے۔ اِس بنا پر وہ دوسروں کا اعتراف نہیں کر پاتا۔ یہ رویہ سرتاسر فطرت کے خلاف ہے۔ اِس سے غیر حقیقت پسندانہ (unrealistic) مزاج پیدا ہوتا ہے، اور غیر حقیقت پسندانہ مزاج سے زیادہ تباہ کن کوئی اور چیز اِس دنیا میں نہیں۔

بے اعترافی کا مزاج

ابلیس نے تخلیقِ آدم کے وقت اپنے اِس منصوبے کا اعلان کیا تھا کہ وہ نسلِ انسانی کی بڑی تعداد کو گم راہی میں ڈال دے گا (الإسراء: 62)۔ یہ گم راہی کیا ہے۔ یہ گم راہی خود شیطان کے رویّے سے معلوم ہوتی ہے۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ تخلیقِ آدم کے وقت ابلیس نے آدم کا اعتراف نہیں کیا، یہاں تک کہ وہ ابدی طور پر ساری نسلِ انسانی کا دشمن بن گیا (یوسف: 5)

جیسا کہ قرآن سے معلوم ہوتا ہے، ہر انسان کے ساتھ غیر مرئی طور پر (invisibly) ایک شیطان لگا ہوا ہے۔ وہ ہر وقت اور ہر موقع پر آدمی کے اندر اپنے منصوبے کے مطابق، بے اعترافی کا مزاج پیدا کرتا رہتا ہے۔ شیطان کا یہ منصوبہ پوری تاریخ میں کامیاب رہا۔ یہی وجہ ہے کہ ہر عورت اور مرد کا یہ حال ہے کہ اُن کے اندر بے اعترافی کا مزاج (non-appreciating nature) پیدا ہو گیا ہے۔ ہر ایک کا یہ حال ہے کہ اگر ننانوے فی صد مثبت بات ہو اور کوئی ایک منفی بات ہو تو لوگ مثبت پہلوؤں کو چھوڑ کر ایک منفی بات کو لے لیں گے اور فوراً دوسرے کے بارے میں منفی نفسیات کا شکار ہو جائیں گے۔

یہ ہر انسان کی زندگی کا وہ پہلو ہے جہاں اُس کو سب سے زیادہ الرٹ (alert) رہنا چاہئے۔ جب بھی کسی موقع پر دوسروں کے بارے میں منفی خیال آئے تو فوراً یہ سمجھ لینا چاہیے کہ یہ شیطان کا بہکاوا ہے۔ آدمی کو چاہئے کہ وہ فوراً اپنی ارادی طاقت (will-power) کو عمل میں لاتے ہوئے اُس کو مکمل طور پر اپنے دماغ سے نکال دے۔

اعتراف ایک ملکوتی مزاج ہے، اور بے اعترافی ایک شیطانی مزاج۔ اعتراف سے آدمی کے اندر تواضع (modesty) کا مزاج پیدا ہوتا ہے، اور بے اعترافی سے اِس کے برعکس غیر متواضع مزاج پیدا ہوتا ہے۔ آدمی ہر لمحہ اِن دو امکانات کے درمیان ہوتا ہے۔ ایک رویہ اختیار کرنے سے وہ متواضع انسان بن جاتا ہے، جو کسی انسان کی سب سے بڑی صفت ہے۔ اور دوسرا رویہ اختیار کرنے سے وہ ایک غیر متواضع انسان بن جاتا ہے، جو کسی انسان کے لیے سب سے بُری صفت ہے۔

ردّعمل، انتہاپسندی

یہ ایک عام تجربہ ہے کہ جب کوئی شخص ردعمل کی نفسیات کے تحت سوچے تو ہمیشہ اس کی سوچ انتہاپسندانہ سوچ بن جاتی ہے۔ ایسا انسان کبھی معتدل انداز میں نہیں سوچ سکتا:

Thinking out of reaction, always takes the form of extremist thinking.

اِس معاملے کی مثالیں مذہب اور غیر مذہب دونوں دائروں میں کثرت سے پائی جاتی ہیں۔ یہ معاملہ اتنا زیادہ عام ہے کہ شاید اِس میں کوئی استثناء (exception) نہیں۔

مثلاً ترکی میں جب 1923 میں عثمانی خلافت کا خاتمہ ہوا تو اُس کو ہمارے علماء اور ہمارے رہنماؤں نے الغاءِ خلافت کا نام دیا تھا، یعنی خلافت کے سیاسی ادارے کو ایبالش (abolish) کرنا۔ یہ ردعمل کا کلمہ تھا۔ چناں چہ اِس کے نتیجے میں مسلمانوں کے اندر خلافت کے دوبارہ قیام کے لیے متشددانہ تحریک چل پڑی۔

اِس کے برعکس، اگر اس کو سقوطِ خلافت کا نام دیا جاتا، یعنی خلافت کا ختم ہوجانا تو ایسا نہ ہوتا۔ اِسی طرح اسلام کو جب شریعت کے نفاذ کا معاملہ بتایا جاتا ہے تو وہ ردعمل کی نفسیات کا نتیجہ ہوتا ہے۔ چناں چہ اس کے نتیجے میں مسلح جہاد شروع ہوجاتا ہے۔ اِس کے برعکس، اگر شریعت کی پیروی کا لفظ بولا جائے تو اس سے متشددانہ تحریک نہیں ابھرے گی۔

ردعمل کی سوچ دوسروں کے رویّے کو دیکھ کر جوابی طور پر ابھرتی ہے۔ اِس لیے اس میں ہمیشہ منفی محرک موجود رہتا ہے، جو اس کو تشدد کی طرف لے جاتا ہے۔ اس کے برعکس، مثبت سوچ کے تحت جو ذہن بنتا ہے، وہ ہمیشہ خود احتسابی (self-introspection) کا ذہن ہوتا ہے۔ اس میں اپنی اصلاح آپ کا جذبہ ابھرتا ہے، نہ کہ دوسروں کے خلاف تشدد کا جذبہ۔ اِس دنیا کا قانون یہ ہے کہ — جیسی سوچ، ویسا عمل۔ سوچ اگر درست ہوگی تو عمل بھی درست ہوگا۔ اور اگر سوچ غلط ہو تو عمل بھی غلط ہو کر رہ جائے گا۔

شکایت کا مزاج

ایک شخص نے کسی کے بارے میں کچھ شکایت کی بات کی۔ میں نے کہا کہ شکایت قاتلِ روحانیت ہے۔ شکایت اتنی زیادہ بری چیز ہے کہ آپ کو مطلقاً اُس سے دور رہنا چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ شکایت سے مطلقاً کیسے بچا جاسکتا ہے، کیوں کہ شکایت کے اسباب اِس دنیا میں ہمیشہ پیش آتے رہتے ہیں۔ میں نے کہا کہ یہی تو آپ کا امتحان ہے کہ آپ شکایت کے باوجود بے شکایت بن کر اِس دنیا میں رہیں، منفی تجربات کے باوجود آپ مثبت نفسیات میں جینا سیکھیں۔ یہی اِس دنیا میں انسان کا امتحانی پرچہ (test-paper) ہے۔ ہر ایک کو اِس امتحان سے گزرنا ہے۔ اِس امتحان میں کامیاب ہونے والا ہی کامیاب ہے، اور اِس امتحان میں ناکام ہونے والا ہی ناکام۔ مزید یہ کہ یہ ناکامی بھی ابدی ہے، اور یہ کامیابی بھی ابدی۔

شکایت کوئی سادہ چیز نہیں۔ شکایت کے ساتھ ناشکری جڑی ہوئی ہے۔ جس دل میں شکایت ہوگی، وہ شکر کے جذبات سے محروم ہوجائے گا۔ مزید یہ کہ شکایت گندگی کے مانند ہے۔ گندگی کی ایک بوند پانی کے پورے ٹب کو گندا کر دیتی ہے۔ اِسی طرح شکایت کی تھوڑی مقدار بھی شکر کی نفسیات سے آدمی کو محروم کر دیتی ہے۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ اِس معاملے میں اتنا زیادہ حساس ہو کہ وہ کسی بھی حال میں شکر کا ایروژن (erosion) گوارا نہ کر سکے۔ وہ شکایت کی باتوں کو نظر انداز کرتا رہے، تاکہ اس کے شاکرانہ مزاج میں کوئی کمی نہ آنے پائے۔

اِس مہلک برائی سے بچنے کا طریقہ صرف ایک ہے، اور وہ ہے آغاز ہی میں اُس کا خاتمہ کر دینا— تھوڑی سی شکایت کو بھی اتنا گھٹایئے، اتنا گھٹایئے کہ اس کو زیرو کے درجے تک پہنچا دیجئے۔ اور شکر کی تھوڑی سی بات کو بھی اتنا بڑھایئے، اتنا بڑھایئے کہ اس کو صد فی صد تک پہنچا دیجئے۔ یہی واحد تدبیر ہے جس کے ذریعے آپ اپنی شخصیت کو ایسا بنا سکتے ہیں کہ آپ کے اندر صرف شکر ہی شکر ہو، ناشکری کا ایک ذرہ بھی آپ کی شخصیت کے اندر باقی نہ رہے۔ شکر کے احساس میں جینے والوں کے لیے ابدی جنت ہے، اور ناشکری کے احساس میں جینے والوں کے لیے ابدی جہنم۔

دو عظیم فکری انقلابات

Two Great Intellectual Revolutions

مذہبی نقطۂ نظر سے انسانی تاریخ میں دو بڑے فکری انقلابات پیش آئے ہیں۔ ایک انقلاب وہ ہے جو اپنی آخری صورت میں ساتویں صدی عیسوی میں پیش آیا۔ اِس انقلاب کے ہیرو وہ لوگ تھے جن کو اسلامی تاریخ میں 'اصحابِ رسول' کہا جاتا ہے۔ دوسرا فکری انقلاب لانے والوں کو حدیث میں 'اخوانِ رسول' کا نام دیا گیا ہے۔ اصحاب رسول نے شرک (polytheism) کے فکری غلبہ کو ختم کیا تھا اور توحید (monotheism) کے بند دروازوں کو کھولا تھا۔ اخوانِ رسول کے لیے یہ مقدر ہے کہ وہ موجودہ زمانے میں الحاد کے فکری غلبہ کو ختم کرکے دوبارہ توحید کو اس کا غالب مقام عطا کریں۔

امت کے دو گروہ ایسے ہیں جن کو خصوصی تاریخی درجہ حاصل ہے — اصحابِ رسول، اور اخوانِ رسول۔ یہ دونوں پُر اسرار الفاظ نہیں ہیں اور نہ کسی پر اسرار فضیلت کی بنا پر اُن کو یہ امتیازی درجہ عطا ہوا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دونوں گروہ اسلام کی تاریخ میں دو بڑے کارنامے انجام دیں گے۔ اِسی کارنامے کی بنا پر وہ بڑا درجہ پائیں گے — اصحابِ رسول کے کارنامے کا تعلق، اسلام کے دورِ اول سے ہے، اور اخوانِ رسول وہ لوگ ہیں جو اسلام کے دورِ آخر میں اپنا کارنامہ انجام دیں گے۔

اصل یہ ہے کہ تاریخ کے دو دور ہیں۔ پہلا، دورِ شرک اور دوسرا، دورِ الحاد۔ قدیم بادشاہت کے زمانے میں شرک کو ریاستی مذہب (state religion) کی حیثیت حاصل ہوگئی تھی۔ اِس بنا پر قدیم زمانے میں مذہبی جبر (religious persecution) کے حالات پیدا ہوئے۔ اصحابِ رسول نے یہ کیا کہ غیر معمولی جدوجہد اور قربانی کے ذریعے شرک کا رشتہ سیاسی اقتدار سے منقطع کر دیا اور اِس طرح شرک کو مکمل طور پر ایک بے زور عقیدہ بنا دیا، اصحابِ رسول کا یہی وہ غیر معمولی عمل تھا جس کی بنا پر دنیا میں مذہبی آزادی (religious freedom) کا دور آیا اور شرک محض ایک بے زور شخصی عقیدہ بن کر رہ گیا۔

بعد کے زمانے میں ایک نیا فتنہ پیدا ہوا جس کو سائنسی الحاد کہا جا سکتا ہے۔ الحاد (atheism)

ہمیشہ سے دنیا میں پایا جاتا رہا ہے۔ لیکن موجودہ زمانے میں ملحد مفکرین کو یہ موقع ملا کہ وہ بظاہر سائنسی دلائل کے ذریعے الحاد کو نئی طاقت کے ساتھ لوگوں کے سامنے پیش کرسکیں۔ مثال کے طور پر ڈارون ازم (Darwinism) کو الحاد کی حمایت میں سائنسی دلیل کے طور پر پیش کرنا۔

موجودہ زمانے کا سائنسی الحاد اصلاً سائنسی الحاد نہیں ہے، بلکہ وہ مغالطہ آمیز قسم کے بظاہر سائنسی دلائل کی بنیاد پر الحادی فکر کی عمارت کھڑی کرنا ہے۔ اب اُن لوگوں کو اخوانِ رسول کا درجہ ملے گا جو اِس فریب کا پردہ چاک کریں اور الحاد کا رشتہ مفروضہ دلائل سے منقطع کردیں، اور اِس طرح الحاد کو بے دلیل اور علمی اعتبار سے بے وزن بنادیں۔

پچھلے دور میں اصحابِ رسول نے جو کارنامہ انجام دیا، اُس کے لیے اللہ تعالیٰ نے سیکڑوں سال کے عمل کے دوران مخصوص تاریخی حالات پیدا کیے تھے۔ یہ تاریخی حالات وہ مواقع تھے جن کو اصحاب رسول نے سمجھا اور اُن کو دانش مندانہ طور پر استعمال کرکے مطلوب انقلاب برپا کیا۔ اِسی طرح بعد کے زمانے میں اخوانِ رسول کے ذریعے جو فکری انقلاب واقع ہوگا، اس کے لیے ضروری مواقع بھی خدا کی طرف سے پیدا کیے جانے والے ہیں۔ اخوانِ رسول کا کام بھی یہی ہے کہ وہ اپنے دور میں پیدا ہونے والے مواقع کو سمجھیں اور اُن کو دانش مندانہ طور پر استعمال کرکے اُس تاریخی عمل کو انجام دیں جس کو ظہور میں لانا اُن کے لیے مقدر کیا گیا ہے۔ ذیل میں دوسرے دور کے حالات کا مختصر طور پر ذکر کیا جاتا ہے۔

جدید الحاد

الحاد (atheism) کوئی نیا ظاہرہ نہیں۔ قدیم زمانے میں بھی کسی نہ کسی صورت میں الحادی فکر پایا جاتا رہا ہے۔ لیکن قدیم زمانے میں الحاد کے لیے کوئی فکری بنیاد (rational base) موجود نہ تھی۔ اِس لیے قدیم زمانے میں الحاد کو زیادہ فروغ حاصل نہ ہوسکا۔

موجودہ زمانے میں جب سائنسی تحقیقات سامنے آئیں تو دورِ جدید کے ملحدین نے محسوس کیا کہ وہ سائنسی تحقیقات کو اپنے حق میں ایک علمی ثبوت کے طور پر استعمال کرسکتے ہیں۔ اِس طرح وہ فلسفہ وجود میں آیا جس کو سائنسی فلسفہ (scientific philosophy) کہا جاتا ہے۔ سائنسی فلسفہ کیا ہے۔

سائنسی فلسفہ دراصل مبنی بر سائنس الحاد (science-based atheism) کا دوسرا نام ہے۔ اِس طرح بیسویں صدی عیسوی میں بہت سے فلسفی اٹھے جنھوں نے سائنسی تحقیقات کو ملحدانہ فلسفے کے حق میں استعمال کیا۔ اِس طرح وہ جدید الحاد وجود میں آیا جس کو سائنسی الحاد کہا جاسکتا ہے۔ اِس موضوع پر کثیر تعداد میں کتابیں لکھی گئیں ہیں۔ بطور مثال یہاں صرف ایک کتاب کا نام درج کیا جاتا ہے:

Julian Huxley, *Religion Without Revelation* (1967)

سائنسی الحاد، خالص منطقی اعتبار سے، ایک غیر علمی الحاد ہے۔ سائنسی الحاد کے داعیوں نے غیر علمی طور پر سائنسی حقیقتوں کو اپنے حق میں پیش کرنے کی کوشش کی تھی۔ چناں چہ اِسی زمانے میں ایک اور طبقہ پیدا ہوا جو نسبتاً زیادہ سنجیدہ تھا۔ وہ سائنسی حقائق کے غیر علمی استعمال کے خلاف تھا۔ اِس دوسرے طبقے نے کوشش کی کہ سائنسی حقائق کو اس کے صحیح تناظر (perspective) میں پیش کیا جائے۔ یہ دوسرا طبقہ اپنے اعلان کی حد تک مذہبی نہیں تھا، وہ بظاہر سیکولر تھا۔ لیکن اُس نے یہ اہم کام انجام دیا کہ اس نے جدید ملحدین کو خالص علمی اعتبار سے مکمل طور پر رد کر دیا۔ اِس معاملے کے چند خاص پہلو ہیں۔

1- اُس کا ایک پہلو یہ ہے کہ جدید سائنس (physical science) نے اپنا میدان تمام تر مادّی اشیاء کی تحقیق کو بنایا۔ اِس کے نتیجے میں بڑی بڑی مادی حقیقتیں دریافت ہوئیں اور مادی نظریات قائم ہوئے۔ اِس صورتِ حال کو استعمال کرتے ہوئے جدید ملحدین نے یہ کیا کہ انھوں نے سچائی کی مادّی تعبیر (material interpretation of truth) کا نظریہ وضع کیا۔ انھوں نے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی کہ حقیقت وہی ہے جو مادی اصطلاحوں میں بیان کی جاسکے، جو چیز مادی اصطلاحوں میں بیان نہ کی جاسکے، وہ حقیقت بھی نہیں۔ اِس نظریے کے رد میں کئی مفکرین نے قیمتی کتابیں لکھیں۔ بطور مثال ایک کتاب کا نام یہ ہے:

Bertrand Russell, *Human Knowledge* (1948)

2- اِس معاملے کا دوسرا پہلو یہ تھا کہ فزیکل سائنس کے مطالعے سے معلوم ہوا کہ دنیا میں جو واقعات ہوتے ہیں، اُن کے پیچھے کوئی سبب (cause) کارفرما ہوتا ہے۔ مثلاً پانی کو گرم کرنے سے

اسٹیم کا وجود میں آنا۔ سائنس کے اس پہلو کو لے کر وہ الحاد موافق نظریہ وضع کیا گیا جس کو اصولِ تعلیل (principle of causation) کہا جاتا ہے۔ اِس نظریے کی بنیاد پر یہ دعویٰ کیا گیا کہ ہماری دنیا میں جو واقعات وجود میں آتے ہیں، وہ کسی مادی سبب کا نتیجہ ہوتے ہیں، نہ کہ کسی خالق کی کارفرمائی کا نتیجہ۔ اِس نظریہ کی تردید میں متعدد قیمتی کتابیں لکھی گئیں۔ مثال کے طور پر اُن میں سے ایک کتاب کا نام یہاں درج کیا جاتا ہے:

James Jeans, *The Mysterious Universe* (1930)

3- اِس معاملے میں غالباً سب سے زیادہ گم راہ کن رول چارلس ڈارون (وفات: 1882) کا ہے۔ اس نے حیاتیاتی نمونوں کے مطالعے کے دوران یہ پایا کہ مختلف حیاتیاتی نمونوں کے درمیان مشابہت (similarity) پائی جاتی ہے۔ اِس کو لے کر اس نے یہ دعویٰ کیا کہ تمام ذی حیات اشیاء ایک ہی مشترک اصل سے نکلی ہیں۔ یہ تصور نظریۂ ارتقا (theory of evolution) کے نام سے جانا جاتا ہے۔ یہ نظریہ جدید دور میں بہت زیادہ پھیلا۔ اس کے بارے میں بے شمار کتابیں لکھی گئیں، یہاں تک کہ جدید علمی حلقے میں اس کو عمومی مقبولیت (general acceptance) حاصل ہوگئی۔

اپنی حقیقت کے اعتبار سے، یہ نظریہ تمام تر علمی مغالطے پر قائم ہے۔ چناں چہ اس کے بارے میں سیکولر علماء نے تحقیق کی اور اِس نظریے کی تردید میں متعدد قیمتی کتابیں شائع ہوئیں۔ مثال کے طور پر اُن میں سے ایک کتاب کا نام یہ ہے:

Arnold Lunn, *Revolt Against Reason* (1951)

دورِ جدید کے یہ اہلِ علم جن کو ہم نے سیکولر اہلِ علم کہا ہے، انھوں نے بہت بڑا تائیدی رول انجام دیا ہے۔ قدیم زمانے میں بہت سے لوگوں نے عظیم تائیدی رول انجام دیا تھا۔ انھوں نے وہ مواقع پیدا کیے تھے جن کو استعمال کر کے اصحابِ رسول نے شرک کے رد اور توحید کے اثبات کا تاریخی کارنامہ انجام دیا۔ اِسی طرح موجودہ زمانے کے مذکورہ سیکولر اہلِ علم نے ایک عظیم تائیدی رول ادا کیا ہے۔ انھوں نے وہ مواقع پیدا کیے ہیں جن کو استعمال کر کے دوبارہ الحاد کے رد اور توحید کے اثبات کا

مطلوب عمل انجام دیا جا سکے۔ بعد میں اٹھنے والے جس گروہ کو حدیث میں اخوانِ رسول کہا گیا ہے، اُس کا کام غالباً یہی ہوگا کہ وہ جدید مواقع کو پہچانے اور ان کو دانش مندانہ استعمال کے ذریعے دوبارہ الحاد کی تردید اور توحید کے اثبات کا مطلوب کارنامہ انجام دے۔

سائنس، الحاد کی تردید

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا، قدیم زمانے میں یہ مطلوب تھا کہ شرک کو رد کر کے توحید کا اثبات کیا جائے۔ یہ کارنامہ اصحابِ رسول نے اپنی کامل صورت میں ساتویں صدی عیسوی میں انجام دیا۔ انھوں نے اپنے زمانے میں پیدا شدہ مواقع کو استعمال کرتے ہوئے ایک ایسا انقلاب برپا کیا جس نے انسانی تاریخ میں ایک نئے عمل (process) کا مؤثر آغاز کیا۔ یہ عمل جاری رہا، یہاں تک کہ شرک، نظریاتی بنیاد (ideological base) سے محروم ہوگیا۔ اب وہ صرف ایک بے روح رسم کے طور پر کچھ توہم پسند لوگوں میں باقی ہے، عملی اعتبار سے وہ ایک زندہ قوت کے طور پر کہیں موجود نہیں۔

یہی معاملہ الحاد کا ہے۔ بیسویں صدی عیسوی میں الحاد بظاہر سائنسی دلائل کے زور پر ابھرا تھا۔ لیکن جلد ہی خود سیکولر حلقے میں ایسے مفکرین پیدا ہوئے جنھوں نے عملی طور پر الحاد کی بظاہر اِس سائنسی بنیاد کو ڈھا دیا اور حقیقت کے اعتبار سے الحاد کو ایک بے دلیل نظریے کی حیثیت دے دی۔ اِس طرح موجودہ زمانے میں دوبارہ امکانی طور پر وہ موافق حالات پیدا ہوئے ہیں جن کو لے کر کچھ لوگ الحاد کو مکمل طور پر رد کر دیں اور اس کے بجائے توحید کو ایک ثابت شدہ نظریہ بنا دیں، اور اِس طرح وہ اُس رول کو انجام دیں جس کو اخوانِ رسول کے ساتھ منسوب کیا گیا ہے۔

یہ حالات پیدا ہو چکے تھے اور میں اکثر ان کے بارے میں غور کرتا تھا۔ آخر کار 1963 میں ایک واقعہ پیش آیا جو میرے لیے گویا کہ ایک رہنما واقعے کی حیثیت رکھتا تھا۔ اِس واقعے کا ذکر میں نے اپنی کتاب ''ظہورِ اسلام'' کے آغاز میں اس طرح کیا ہے:

''ستمبر 1963 کی 21 تاریخ تھی۔ راقم الحروف ندوہ (لکھنؤ) کی مسجد میں تھا اور ظہر کی سنتیں پڑھ کر جماعت کے انتظار میں بیٹھا ہوا تھا۔ ذہن میں خیال گھوم رہا تھا کہ اسلام کے تعارف

کے لئے آج ایک ایسی کتاب کی ضرورت ہے جو وقت کی زبان اور اسلوب (modern idiom) میں لکھی گئی ہو اور جدید انسان کو مطالعہ کے لیے دی جا سکے۔'' کاش اللہ تعالیٰ مجھے اِس کتاب کے لکھنے کی توفیق دے'' یہ تمنا بے ساختہ دعا کی شکل میں میری زبان سے نکلی اور اس کے بعد یکایک یہ انگریزی لفظ میری زبان پر تھا:

God Arises

یہ گویا کتاب کا نام تھا جو اچانک میرے ذہن میں وارد ہوا۔ اس سے پہلے کبھی یہ فقرہ میرے ذہن میں نہیں آیا تھا، حتی کہ کتاب کے نام کی حیثیت سے اس کی معنویت بھی اُس وقت پوری طرح واضح نہ تھی۔ شام کو عصر کی نماز کے بعد میں حسب معمول لکھنؤ کی نریندر دیو لائبریری گیا جو ندوہ کے قریب دریائے گومتی کے کنارے واقع ہے۔ وہاں ویبسٹر کی لغت میں لفظ Arises کے استعمال دیکھے تو معلوم ہوا کہ یہ لفظ بائبل کی ایک آیت میں استعمال ہوا ہے۔ پورا فقرہ یہ ہے:

> Let God arise, let His enemies be scattered. Let them also that hate Him flee before Him. As smoke is driven away, so drive them away; As wax melteth before the fire, so let the wicked perish at the presence of God (Psalm 68: 1-2)

'' خدا اٹھے، اس کے دشمن تتر بتر ہوں۔ وہ جو اس کا کینہ رکھتے ہیں، اس کے حضور سے بھاگیں، جس طرح دھواں پراگندہ ہوتا ہے، اسی طرح تو انھیں پراگندہ کر۔ جس طرح موم آگ پر پگھلتا ہے، شریر خدا کے حضور فنا ہوں''۔

یہ میرے لیے ایک انسپریشن (inspiration) تھا۔ یہ گویا ایک قسم کا الہامی تجربہ تھا جو مسجد کے اندر اذان اور اقامت کے درمیان پیش آیا۔ اِس پر غور کرنے کے بعد میں نے سمجھا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک اشارہ ہے، تاکہ میں پیدا شدہ جدید علمی مواقع کا جائزہ لوں اور اُن کو الحاد کی تردید اور توحید کے علمی اثبات کے لیے استعمال کروں۔ یہ گویا سیکولر اہلِ علم کے پیدا کردہ علمی امکانات کو

اسلامائز کرنا تھا۔ اور جدید دور میں اظہارِ دین کے اُس علمی واقعے کو بروئے کار لانا تھا جس کے امکانات وقوع میں آچکے ہیں، لیکن ابھی ان کو استعمال نہ کیا جاسکا۔

اِس موضوع پر میں پہلے بھی کام کررہا تھا۔ لیکن مذکورہ تجربے کے بعد میرے شعور میں ایک نئی بیداری آئی اور میں اِس قابل ہوگیا کہ زیادہ حوصلے کے ساتھ اِس علمی خدمت کو انجام دوں۔ آخرکار، طویل کوشش کے بعد وہ کتاب وجود میں آئی جو مذکورہ تجربے کی روشنی میں گاڈ ارائزز (God Arises) کے نام سے 1985 میں شائع ہوئی۔ اِس سے پہلے یہ کتاب اردو اور عربی زبان میں چھپ چکی تھی۔ لیکن مذکورہ انگریزی ایڈیشن مزید اضافے کے ساتھ اس کا زیادہ جامع ایڈیشن تھا۔

اِس کے بعد یہی موضوع (modern challenges to Islam) میرا مستقل موضوع بن گیا۔ اس کے بعد مضامین اور کتابوں کی شکل میں میری سیکڑوں کوششیں مختلف زبانوں میں شائع ہوئیں۔ میری اِن تمام تحریروں کا موضوع مشترک طور پر صرف ایک تھا، اور وہ اسلام اور عصری تحدیات تھا۔ بعد کے زمانے میں براہِ راست یا بالواسطہ طور پر یہی میری زندگی کا مستقل موضوع بن گیا۔

تباہ کن غلط فہمی

عباسی دور میں مسلمانوں کے اندر دینی زوال آیا۔ اس زمانہ میں مسلمانوں کا یہ حال ہوا کہ کچھ رسمی اعمال اور مخصوص وضع قطع دینداری کی علامت بن گئے۔

اسی زمانہ میں قُصّاص (story tellers) پیدا ہوئے۔ وہ ان رسمی اعمال کے پراسرار فضائل پر خود ساختہ کہانیاں لوگوں کو سنانے لگے۔ اس طرح لوگ اس رسمی دین داری پر مزید پختہ ہو گئے۔ اپنا محاسبہ (introspection) کرنے کا جذبہ ختم ہو گیا۔

موجودہ زمانہ میں یہی خرابی مزید اضافہ کے ساتھ ظہور میں آئی ہے۔ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں نے ان رسمی اعمال کو دین داری سمجھ لیا۔ دوبارہ ان کے درمیان ایسی شخصیتیں اور ایسی جماعتیں پیدا ہوئی ہیں جو ان رسمی اعمال کے فضائل کے بارے میں لوگوں کو پراسرار قسم کے قصے کہانی سنا رہے ہیں۔ اس طرح وہ مسلمانوں کے اندر محاسبہ کا مزاج تو پیدا نہیں کرتے، البتہ فضیلت کی کہانیوں کے ذریعے وہ ان کے اندر یہ فرضی یقین پیدا کر رہے ہیں کہ تمھاری رسمی دین داری ہی اصل دین داری ہے۔ اور اسی کے ذریعہ تم خدا کی نصرتوں کو حاصل کرو گے اور آخر کار جنت میں پہنچ جاؤ گے۔

یہ بلاشبہہ گم راہی ہے۔ جو لوگ اس گم راہی سے بے خبر ہیں، وہ اندھے پن کا شکار ہیں اور جو لوگ اس سے باخبر ہیں لیکن وہ اس کے بارے میں خاموش ہیں، وہ حدیث کے الفاظ میں ''گونگے شیطان'' بنے ہوئے ہیں۔ موجودہ زمانہ میں اصلاح امت کا سب سے بڑا کام یہی ہے کہ مسلمانوں کو اس تباہ کن غلط فہمی سے باہر لایا جائے۔

پچھلی امتیں جس بگاڑ کا شکار ہوئیں، اُس بگاڑ کو قرآن میں امانی (البقرۃ: 78) کہا گیا ہے۔ امانی سے مراد خوش فہمی (wishful-thinking) ہے، یعنی کچھ رسمی اعمال کرنا اور اُس پر بڑے بڑے انعامات کی امید قائم کر لینا۔ یہی پچھلی امتوں کا بگاڑ تھا، اور حدیث کی پیشین گوئی کے مطابق، یہی خود مسلمانوں کے ساتھ بھی دورِ آخر میں پیش آئے گا۔

فخر اور نفرت

انسان کا مطالعہ بتاتا ہے کہ ہر عورت اور ہر مرد کے اندر ایک نفسیات مشترک طور موجود رہتی ہے — فخر اور نفرت۔ فخر کا جذبہ اپنے لیے، اور نفرت کا جذبہ دوسروں کے لیے۔ ہر آدمی اِنھیں دو احساسات کے درمیان جیتا ہے اور اِنھیں دو احساسات کے درمیان مرجاتا ہے۔

یہ دونوں جذبات اتنے قوی ہیں کہ فخر کا اگر صرف ایک ذرہ اسے مل جائے تو اس کو لے کر وہ اپنے فخر کا گنبد کھڑا کر دیتا ہے۔ اِس طرح اگر اُس کو نفرت کا ایک ذرہ مل جائے تو اُس کو لے کر وہ دوسروں کو نفرت کا موضوع بنالیتا ہے۔ یہ دونوں جذبے اتنا زیادہ عام ہیں کہ اُس کو انسان کا عالمی مزاج کہا جاسکتا ہے۔

اِس مزاج کا یہ نتیجہ ہے کہ ہر آدمی اپنے بارے میں فخر کی نفسیات میں جیتا ہے، اور دوسرے کے بارے میں نفرت کی نفسیات میں۔ یہ دونوں جذبات دھیرے دھیرے انسان کے لاشعور کا حصہ بن جاتے ہیں، یہاں تک کہ انسان کا یہ حال ہوجاتا ہے کہ اُس کو اِس معاملے میں سوچنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ہر صورتِ حال میں یہ چیزیں اپنے آپ اس کے اندر پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ ہر صورتِ حال اپنے آپ اُس کو اپنے لیے فخر کی غذا دینے والی بن جاتی ہے۔

اِس طرح ہر صورتِ حال اپنے آپ اُس کو دوسروں کے بارے میں نفرت کی غذا دیتی رہتی ہے۔ یہ دوطرفہ نفسیاتی عمل آدمی کے اندر اِس طرح مسلسل طور پر جاری رہتا ہے کہ اِس میں اس کی کنڈیشننگ ہوجاتی ہے۔

یہ برائی آدمی کے اندر سوچے بغیر اپنے آپ پیدا ہوتی ہے۔ لیکن جب اُس کو ختم کرنا ہو تو آدمی کو سوچ کر اسے ختم کرنا ہوتا ہے۔ یہ اِس معاملے کا سب سے زیادہ نازک پہلو ہے۔ اِس معاملے میں کوئی شخص اپنی اصلاح اُسی وقت کرسکتا ہے، جب کہ وہ شعوری طور پر اس کو دریافت کرلے، وہ شعوری طور پر اپنے اوپر اصلاح کا عمل کرنے لگے۔

مسلمان عالمی محاصرہ میں

موجودہ زمانے کے تعلیم یافتہ مسلمانوں کا عام مزاج یہ ہے کہ مسلمان عالمی سطح پر زیر محاصرہ (under seige) ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ تمام قومیں مسلمانوں کی مخالف ہیں۔ تمام قوموں نے مسلمانوں کے خلاف سازش کر رکھی ہے۔ تمام قومیں متفقہ طور پر یہ چاہتی ہیں کہ مسلمان دوبارہ ابھرنے نہ پائیں، چناں چہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہر سطح پر مسلمانوں کے خلاف کارروائیاں جاری ہیں۔

یہ سوچ سرتاسر ایک بے بنیاد سوچ ہے۔ خالص علمی اعتبار سے اِس کی کوئی حقیقت نہیں۔ اصل یہ ہے کہ موجودہ دنیا کا نظام خود خالق کے نقشے کے مطابق، مسابقت (competition) اور چیلنج پر قائم ہے۔ یہ فطرت کا نظام ہے۔ اس نظام کے بنا پر کوئی آگے بڑھتا ہے اور کوئی پیچھے ہو جاتا ہے، کوئی پانے والا بنتا ہے اور کوئی کھونے والا۔ یہ نظام اِس لیے ہے تاکہ زندگی کی سرگرمیاں جاری رہیں، تاکہ ہر فرد اور ہر گروہ کو عمل کا محرک (incentive) ملتا رہے۔

فطرت کے اِس نظام کی بنا پر ایسا ہوتا ہے کہ ایک گروہ اپنی کوشش کے ذریعے آگے بڑھ جاتا ہے اور وہ دوسرے گروہ کو پیچھے چھوڑ دیتا ہے۔ ایسی حالت میں پچھڑے ہوئے گروہ کو چاہئے کہ وہ اپنے عمل کی نئی منصوبہ بندی کرے، وہ کھوئی ہوئی بازی کو دوبارہ جیتنے کے لیے اپنی ساری توانائی خرچ کر دے۔ زندگی کو چیلنج سمجھنا آدمی کو نیا جذبۂ عمل دیتا ہے۔ اِس کے برعکس، سازش اور دشمنی کا نظریہ آدمی کو منفی نفسیات میں مبتلا کر کے اس کو زندگی کی دوڑ میں پیچھے ڈال دیتا ہے۔

موجودہ زمانے کے مسلمانوں کا مسئلہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنے رہنماؤں کی غلط رہنمائی کے نتیجے میں چیلنج کو محاصرہ سمجھ لیا۔ انھوں نے ایک مثبت واقعے کو خالص منفی رخ دے دیا۔ مسلمانوں کی یہی غلط سوچ ہے جس کی اصلاح میں ان کی ترقی کا راز چھپا ہوا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں موجودہ زمانے کے مسلمان زوال کا شکار ہوئے ہیں۔ اور یہی وہ مقام ہے جہاں وہ اپنی اصلاح کر کے دوبارہ عروج تک پہنچ سکتے ہیں۔

شریعتِ محمدی کا نفاذ

موجودہ زمانے میں انقلاب پسند مسلمانوں کا ایک عمومی نعرہ وہ ہے جس کو شریعتِ محمدی کا نفاذ کہا جاتا ہے۔ یہ بلاشبہہ ایک خود ساختہ نعرہ ہے۔ اِس کی تائید قرآن اور حدیث سے نہیں ہوتی۔ اِس کے برحق ہونے کے لیے ضروری ہے کہ قرآن اور حدیث میں کوئی حکم اِس طرح کے الفاظ میں آیا ہو: **نفِّذ شریعةَ محمد** (شریعتِ محمدی کو نافذ کرو) اور جب قرآن اور حدیث میں کوئی حکم اِس طرح کے الفاظ میں نہ آیا ہو تو اس کی بنیاد پر سیاست چلانا بلاشبہہ ایک مُبتدعانہ سیاست ہے، وہ کوئی اسلامی کام نہیں۔

نفاذِ شریعت کا تصور کوئی سادہ تصور نہیں، یہ اسلام کے اندر ایک بہت بڑی برائی داخل کرنے کے ہم معنی ہے۔ اِس تصور نے اسلام کو بزور نفاذ (forceful implementation) کا موضوع بنا دیا ہے، حالاں کہ اسلام اپنی حقیقت کے اعتبار سے اختیارانہ پیروی کا نام ہے۔ ''نفاذِ شریعت'' ایک خوب صورت لفظ ہے، لیکن عملی نتیجے کے اعتبار سے وہ تخریب کاری ہے، اور صرف تخریب کاری۔

اسلام کو جب اختیارانہ پیروی کے اعتبار سے لیا جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ فرد کے اندر مثبت ذہن پیدا ہوتا ہے، سماج کے اندر تعمیری قدریں فروغ پاتی ہیں، اجتماعی زندگی کے ہر شعبے میں امن قائم ہوتا ہے، وغیرہ۔ اِس کے برعکس، جب اسلام کو بزور نفاذ کا موضوع بنا دیا جائے تو اس کے نتیجے میں لازمی طور پر انتہا پسندی (extremism) کا مزاج پیدا ہوتا ہے۔ سماج میں رواداری (tolerance) کا مزاج ختم ہو جاتا ہے۔

اِس کے نتیجے میں پہلے لوگوں کے اندر شدت پسندی آتی ہے۔ جب شدت پسندی سے مقصد حاصل نہ ہو تو مسلّح ٹکراؤ شروع ہو جاتا ہے، اور جب وہ بھی ناکافی ہو تو اس کے بعد وہ آخری برائی پیدا ہو جاتی ہے جس کو خودکش بم باری (suicide bombing) کہا جاتا ہے۔ اور خودکش بم باری بلاشبہہ وہ برائی ہے جس کے بعد برائی کا کوئی اور درجہ نہیں۔

ارتقاء یا مغالطہ

ریڑھ کی ہڈی انسان کے جسم کا ایک کم زور حصہ ہے۔ ریڑھ کے نیچے کا حصہ بہت جلد متاثر ہوجاتا ہے اور وہ تکلیف شروع ہوجاتی ہے جس کو پیٹھ کا درد (backache) کہا جاتا ہے۔ نظریۂ ارتقاء کے حامی اِس کو ارتقائی عمل سے جوڑتے ہیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ انسان ابتداءً چوپائے کی شکل میں تھا، جیسا کہ گھوڑا ہوتا ہے۔ پھر اُس نے پیچھے کے پاؤں پر کھڑا ہونے کی کوشش کی، یہاں تک کہ وہ انسان کی صورت میں ایک سیدھا حیوان بن گیا۔ اب اس کے پچھلے پاؤں بدستور پاؤں رہے، اور اگلے دونوں پاؤں ہاتھ کی مانند ہوگئے۔ سیدھا حیوان بننے کے بعد اس کا سارا بوجھ ریڑھ کی ہڈی پر آ گیا۔ یہی سبب ہے کہ ریڑھ کی ہڈی کا نچلا حصہ نہایت آسانی سے تکلیف کا شکار ہوجاتا ہے۔

یہ سرتاسر ایک مغالطہ ہے۔ چار پیروں والے حیوان کا دو پیروں والا حیوان بن جانا صرف ایک غیر ثابت شدہ قیاس ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ریڑھ کی ہڈی کی تکلیف قدیم زمانے کے انسان کو نہیں ہوتی تھی، یہ صرف موجودہ زمانے کے انسان کا مسئلہ ہے۔ موجودہ زمانے کا انسان کمفرٹ کلچر (comfort culture) میں جیتا ہے۔ اِس قسم کی بیماریاں اِسی کمفرٹ کلچر کا نتیجہ ہیں، اس کا نظریہ ارتقاء سے کوئی تعلق نہیں۔

Backache is a common health problem

With reference to the Backache is a common health problem 'Talking back' (TOI, June 13) by Jug Suraiya, backache is indeed one of the most common complaint that people suffer from at some stage in their lives. The most common causes behind the problem are poor posture, improper lifting or bending. A sedentary lifestyle with little or no exercise and overexertion of the body can be harmful too. One explanation for the vulnerability of the lower back is that it is one of the weakest parts in the human body, having evolved from walking on fours to walking upright. This unique evolutionary adaptation is a relatively recent change. As a result, the stresses acting upon the vertebral column are unique in many respects and result in a variety of problems that are peculiar to the human species. A proper posture can go a long way towards providing relief from backaches. (Subhash Kaura, *The Times of India,* New Delhi, June 15, 2009)

تاریخ کے تین دور

کائنات کی عمر تقریباً 15 بلین سال بتائی جاتی ہے۔ زمین پر انسان کی عمر تقریباً 50 ہزار سال ہے۔ زمین پر انسانی تاریخ کے تین دور ہیں— ابتدائی دورِ تہذیب تک، روایتی فریم ورک سے سائنٹفک فریم ورک تک، غیر معیاری دنیا سے معیاری دنیا تک:

From primitive age to modern civilization.

From traditional framework of mind to scientific framework of mind.

From imperfect world to a perfect world.

انسانی تاریخ کا ابتدائی دور تہذیبی ارتقاء کا دور ہے۔ وہ آدم اور حوا کے بعد شروع ہوا اور بیسویں صدی عیسوی کے آخر میں اپنی تکمیل تک پہنچ گیا۔

قدیم زمانے میں انسان کے پاس سوچنے کا جو فریم ورک تھا، وہ روایتی فریم ورک تھا۔ اِس میں دھیرے دھیرے ترقی ہوئی، یہاں تک کہ جدید سائنس (modern science) کا دور آیا اور انسان کو سوچنے کے لیے سائنٹفک فریم ورک حاصل ہو گیا۔

موجودہ دنیا میں وہ تمام مادّی چیزیں موجود ہیں جن کو انسان چاہتا ہے۔ لیکن موجودہ دنیا کی کوئی بھی چیز معیاری چیز نہیں۔ انسان اپنی پیدائش کے اعتبار سے معیار پسند (idealist) ہے، لیکن موجودہ دنیا اُس کی نسبت سے ایک غیر معیاری دنیا ہے۔ یہ تضاد آخر کار ختم ہوگا۔

اِس معیاری دنیا کے بننے کا وقت اب بہت قریب آچکا ہے۔ مگر اِس معیاری دنیا میں صرف منتخب افراد کو جگہ ملے گی۔ موجودہ دنیا میں جن لوگوں نے اپنی اہلیت ثابت کی ہوگی، اُن کو منتخب کر کے اگلی معیاری دنیا میں بسا دیا جائے گا۔ باقی لوگ عالمی کوڑے خانے میں ڈال دیے جائیں گے، پہلا گروہ ابدی راحتوں کی دنیا میں جگہ پائے گا، اور دوسرا گروہ ابدی محرومی کی دنیا میں۔

اصلاحِ نصاب، یا اصلاحِ ماحول

مسلم رہنماؤں کے درمیان عرصے سے یہ تحریک چل رہی ہے کہ دینی مدارس کا نصاب (syllabus) بدلا جائے۔ یہ اصل مسئلے کا صرف کم تر اندازہ ہے۔ دینی مدارس میں بلاشبہہ اصلاح کی ضرورت ہے، لیکن اِس ضرورت کا تعلق اصلاً اصلاحِ نصاب سے نہیں ہے، بلکہ اصلاحِ ماحول سے ہے۔ موجودہ حالت میں خواہ مدارس کا نصاب بدل دیا جائے یا اس کو باقی رکھا جائے، دونوں صورتوں میں یقینی طور پر مطلوب نتیجہ نکلنے والا نہیں۔

دینی مدارس کا اصل مسئلہ یہ نہیں ہے کہ وہاں کا نصاب قابلِ تبدیلی ہے، دینی مدارس کا اصل مسئلہ وہاں کا قدامت پرستانہ ماحول ہے جس کو بدلنا ضروری ہے۔ موجودہ صورتِ حال یہ ہے کہ دینی مدارس میں مکمل طور پر جمود (stagnation) کی فضا قائم ہے۔ اِن مدارس میں آزادانہ سوچ کو شجرِ ممنوعہ سمجھا جاتا ہے۔ ہر مدرسے کہ کچھ مقدس اکابر ہیں۔ اِن اکابر کے خلاف سوچنا لوگوں کے نزدیک جرمِ عظیم کا درجہ رکھتا ہے۔ مدارس کا یہی جامد ماحول مدارس کے جدید رول کی ادائیگی میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ جب تک اِس ماحول کو بدلا نہ جائے، مدارس سے یہ امید نہیں کی جاسکتی کہ وہ دورِ جدید میں اپنا مطلوب رول ادا کرسکیں گے۔

مولانا شبلی نعمانی (وفات: 1914) نے لکھا تھا کہ ہمارے مدارس میں مُتون پڑھائے جاتے ہیں، فنون نہیں پڑھائے جاتے۔ یہ ایک صحیح بات تھی۔ اِس صورتِ حال کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے مدارس میں اساتذہ اور طلبا کی سوچ تمام تر کچھ کتابوں اور ان کتابوں کے مصنفین پر مُرتکز رہتی ہے۔ وہ اِنھیں چند کتابوں کو علم سمجھتے ہیں اور ان کے مصنفین کو علماء کا درجہ دیتے ہیں۔ اِس سے طلبا اور اساتذہ کے اندر بند ذہن پیدا ہوتا ہے۔

اس کے برعکس، اگر ہمارے مدارس میں فنون پڑھا جائیں تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ موضوعات (subjects) زیر بحث آنے لگیں گے۔ اِس طرح غور وفکر کا دائرہ بہت زیادہ وسیع ہوجائے گا۔ اس

طرح سوچ کا دائرہ چند مخصوص علماء تک محدود نہیں رہے گا، بلکہ کسی موضوع پر دوسرے اہلِ علم نے جو کچھ لکھا ہے، وہ بھی غور و بحث کے دائرے میں آجائے گا۔ اس طرح لوگوں کے ذہن کھلیں گے۔ لوگوں کا ذہنی ارتقاء ہوگا۔ لوگوں کے اندر تقلید کے بجائے اجتہاد کی صلاحیت ترقی کرے گی۔ ہر آدمی شعوری یا غیر شعوری طور پر یہ چاہنے لگے گا کہ پچھلے لوگ جو کام کر چکے ہیں، میں اُن سے آگے جاؤں، میں علمی ارتقاء کی مزید منزلیں طے کروں۔

اِس معاملے کی ایک مثال مولانا شبلی نعمانی کی زندگی میں پائی جاتی ہے۔ مولانا شبلی نعمانی نہ صرف یہ کہ ایک اچھے عالم تھے، بلکہ وہ ایک فعال آدمی تھے۔ وہ اظہارِ خیال کی آزادی کو بہت زیادہ پسند کرتے تھے۔ وہ جہاں بھی رہتے تھے، وہاں وہ لوگوں کے اندر یہ اسپرٹ پیدا کرتے تھے کہ وہ کھلے ذہن کے تحت سوچیں اور کھلے ذہن کے تحت رائے قائم کریں اور دورِ جدید کے لحاظ سے اعلیٰ قابلیت پیدا کریں۔ اِس سلسلے میں وہ انگریزی زبان سیکھنے پر بھی زور دیا کرتے تھے۔

اِس کے نتیجے میں ایسا ہوا کہ مولانا شبلی کے قیامِ ندوہ (1905-1913) کے زمانے میں وہاں ایک زندہ علمی ماحول پیدا ہوگیا۔ اسی کا یہ نتیجہ تھا کہ مولانا شبلی نعمانی کے زمانے میں کئی اعلیٰ علمی شخصیتیں پیدا ہوئیں۔ مثلاً مولانا سید سلیمان ندوی (وفات: 1953)، مولانا ابوالکلام آزاد (وفات: 1958)، مولانا عبدالباری ندوی (وفات: 1976)، مولانا عبدالماجد دریابادی (وفات: 1977)، وغیرہ۔

تعلیم کے سلسلے میں دو چیزیں بنیادی اہمیت رکھتی ہیں — نصاب، اور اساتذہ۔ کسی تعلیمی ادارے میں بلاشبہہ نصاب کی بہت اہمیت ہے۔ لیکن نتیجے کے اعتبار سے دیکھا جائے تو نصاب سے بھی زیادہ اہمیت اساتذہ کی ہے۔ نصاب کی حیثیت عملاً ایک ذریعہ کی ہے۔ تاہم اِس ذریعہ کا جو استعمال کرتا ہے، وہ استاذ ہے۔ استاذ اگر لائق اور فعال ہو تو وہ کسی بھی نصاب کو استعمال کرکے طلبا کے اندر مطلوب روح پیدا کرسکتا ہے، اور اگر استاد لائق اور فعال نہ ہو تو اچھے سے اچھا نصاب بھی عملاً بے نتیجہ ہوکر رہ جائے گا۔

ہر گھر بگاڑ کا کارخانہ

آج کل عام طور پر یہ حال ہے کہ ہر گھر میں ایک طرف اپنے بچوں اور اپنے خاندان والوں کی تعریف کی جاتی ہے، اُن کا ذکر ہمیشہ مثبت انداز میں کیا جاتا ہے۔ اِس کے برعکس، جب بھی دوسروں کا چرچا کیا جاتا ہے تو وہ تنقیص کے انداز میں ہوتا ہے۔

اپنوں کے بارے میں مثبت باتوں کا چرچا اور دوسروں کے بارے میں منفی باتوں کا چرچا، یہ کلچر اتنا زیادہ عام ہے کہ شاید ہی کوئی گھر اِس سے خالی ہو۔

گھر کے اندر سماج کے شہری بنتے ہیں، لیکن مذکورہ کلچر نے گھر کو اِس قابل نہیں رکھا ہے کہ وہ اپنے سماج کے لیے اچھے شہری سپلائی کرے۔ ہر گھر میں ایسے عورت اور ایسے مرد بن کر تیار ہو رہے ہیں جو اپنوں کے بارے میں مثبت رائے اور دوسروں کے بارے میں منفی رائے رکھتے ہیں، جن کو اپنوں سے محبت ہے اور دوسروں سے نفرت، جو اپنوں کے بارے میں روادار (tolerant) ہیں اور دوسروں کے بارے میں وہ غیر روادار (intolerant) بنے ہوئے ہیں، جن کے اندر اپنوں کو دینے کا ذہن ہے اور دوسروں سے صرف لینے کا ذہن، جو اپنوں کو برتر سمجھتے ہیں اور دوسروں کو کم تر، جو اپنوں کی ترقی پر خوش ہوتے ہیں اور دوسروں کی ترقی دیکھ کر اُنھیں کوئی خوشی نہیں ہوتی، جو اپنوں کی تکلیف سے فکر مند ہوتے ہیں اور دوسروں کی تکلیف کو دیکھ کر انھیں کوئی فکر مندی لاحق نہیں ہوتی، وغیرہ۔

اِس صورتِ حال کا یہ نتیجہ ہے کہ اب سماجی اقدار (social values) کا تصور ختم ہو گیا ہے۔ اب ایک ہی چیز ہے جو ہر ایک کا واحد کنسرن (sole concern) بنی ہوئی ہے، اور وہ ہے ذاتی مفاد (self-interest)۔ اِس صورتِ حال نے ہر ایک کو خود غرض اور استحصال پسند بنا دیا ہے، کسی کو کم اور کسی کو زیادہ۔ یہ صورتِ حال بے حد سنگین ہے۔ اِس کی اصلاح جلسوں اور تقریروں کے ذریعے نہیں ہو سکتی، اس کی اصلاح کا طریقہ صرف یہ ہے کہ گھر والے اپنے گھر کے ماحول کو درست کریں۔ گھر کے ماحول کو درست کئے بغیر اِس سنگین صورتِ حال کی اصلاح ممکن نہیں۔

خدا کا اعتراف نہیں

آج کل یہ رواج ہے کہ ایک شخص پیسہ کمائے گا اور اس کے بعد وہ ایک کار خرید کر اپنے بیٹے کو دے گا۔ کار کے شیشہ پر لکھا ہوا ہوگا— باپ کی طرف سے تحفہ (Dad's Gift)۔ یہ کوئی سادہ بات نہیں۔ اپنی حقیقت کے اعتبار سے یہ ناشکری کا کلمہ ہے۔ ایک نعمت جو حقیقۃً خدا کی طرف سے ملی ہے، اس کو خدا کی طرف منسوب نہ کرنا، بلکہ اس کو خود اپنے کمالات کے خانے میں ڈال دینا، یہ خدا کے ساتھ بے اعترافی کا معاملہ کرنا ہے، اور خدا کے ساتھ بے اعترافی بلاشبہہ خدا کی اِس دنیا میں سب سے بڑے جرم کی حیثیت رکھتا ہے۔

قرآن کی سورہ نمبر 27 میں بتایا گیا ہے کہ پیغمبر سلیمان بن داؤد کو ایک مادّی نعمت ملی تو انھوں نے فوراً کہا: هٰذا من فضل ربّی (النمل: 40) یعنی یہ میرے رب کے فضل میں سے ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ پیغمبر نے اس کو خدا کی طرف سے عطیہ (God's gift) قرار دیا۔ یہی صحیح ایمانی طریقہ ہے۔ صاحبِ ایمان وہ ہے جو ہر چیز کو خدا کی چیز سمجھے، جو ہر ملی ہوئی چیز کو خدا کی طرف منسوب کرتے ہوئے خدا کا اعتراف کرے۔

دنیا میں انسان کو جو چیزیں ملتی ہیں، وہ بہ ظاہر خود اپنی کوشش کے ذریعے ملتی ہیں، لیکن یہ صرف اس کا ظاہری پہلو ہے۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ ہر چیز مکمل طور پر خدا کا عطیہ ہوتی ہے۔ انسان کا امتحان یہ ہے کہ وہ ظاہری پردے کو پھاڑے، وہ اصل حقیقت کو دریافت کرتے ہوئے ہر ملی ہوئی چیز پر یہ کہہ دے کہ یہ میرے رب کا عطیہ ہے جو براہِ راست طور پر خدا کی طرف سے مجھ کو دیا گیا۔

اِسی اعتراف (acknowledgment) کا مذہبی نام شکر ہے۔ یہاں اُسی شخص کو جائز طور پر رہنے کا حق حاصل ہے جو شکر و اعتراف کی نفسیات کے ساتھ اِس دنیا میں رہے۔ شکر کی یہی نفسیات موجودہ دنیا میں کسی کو جائز طور پر جینے کا حق دیتی ہے۔ اِس کے برعکس، جن لوگوں کے اندر ناشکری اور بے اعترافی کی نفسیات ہو، وہ خدا کی اِس دنیا میں مجرم اور دراندار (intruders) کی حیثیت رکھتے ہیں۔

بچوں کا قبرستان

ایک تعلیم یافتہ مسلمان ہمارے مشن سے جڑے ہوئے تھے۔ اُس وقت ان کے یہاں اولاد نہیں تھی، پھر ان کے یہاں بچے پیدا ہوئے۔ اِس کے بعد وہ دھیرے دھیرے مشن سے دور ہو گئے۔ ایک عرصے کے بعد ان سے ملاقات ہوئی۔ میں نے پوچھا کہ آپ نے دعوتی کام کو کیوں چھوڑ دیا۔ انھوں نے کہا— بچوں کی ذمے داریاں اتنی بڑھ گئی ہیں کہ اب وقت نہیں ملتا۔

موجودہ زمانے میں یہی کم و بیش ہر آدمی کا حال ہے۔ لوگوں کے لیے ان کے بچے ان کا قبرستان بنے ہوئے ہیں۔ ہر آدمی کے لیے اس کے بچے اس کا واحد کنسرن (sole concern) ہیں۔ ہر آدمی اپنا پیسہ، اپنا وقت، اپنی انرجی، غرض جو کچھ اس کے پاس ہے، وہ اس کو اپنے بچوں کے لیے وقف کئے ہوئے ہے۔ دوسروں کے لیے اس کے پاس صرف زبانی ہمدردی (lip service) ہوتی ہے، اور اپنی اولاد کے لیے حقیقی عمل، حتی کہ خدا کے لیے یا خدائی کام کے لیے بھی اس کے پاس صرف الفاظ ہوتے ہیں، اِس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔

آج جس شخص سے ملاقات کیجئے، وہ اپنے بچوں کے مستقبل (future) کے لیے فکر مند ہوگا، لیکن وہ خود اپنے مستقبل کے لیے فکر مند دکھائی نہ دے گا۔ یہ عین وہی صورتِ حال ہے جس کو حدیث میں اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: أذهب آخرته بدنيا غيره ۔ یعنی سب سے زیادہ گھاٹے میں وہ شخص ہے جو دوسرے کی دنیا بنانے کے لیے اپنی آخرت کھودے۔

اِس معاملے کا سب سے زیادہ اندوہناک پہلو یہ ہے کہ لوگ محبتِ اولاد میں اتنا زیادہ غرق ہیں کہ وہ اِس حدیثِ رسول کا مصداق بن گئے ہیں: حبّك الشيئ يعمي ويُصمّ ۔ اولاد کی محبت ان پر اتنا زیادہ غالب ہے کہ وہ یہ بھی سوچ نہیں پاتے کہ ہم اولاد کے مستقبل کو بنانے کی فکر میں خود اپنے مستقبل کو تباہ کر رہے ہیں۔ اِس بنا پر لوگوں کا حال یہ ہے کہ ان کے پاس زیادہ اہم کاموں کے لیے وقت نہیں۔ مثلاً دینی مطالعہ، دعوہ ورک، آخرت کو سامنے رکھ کر اپنے معاملات کی منصوبہ بندی، وغیرہ۔

بحران کا مثبت پہلو

سگمنڈ فرائڈ (Sigmund Freud) 1856 میں آسٹریا (سنٹرل یورپ) میں پیدا ہوا، اور 1939 میں اس کی وفات ہوئی۔ وہ نفسیات کا عالم (psychologist) تھا۔

سگمنڈ فرائڈ اپنے ایک غلط نظریے کی وجہ سے کافی بدنام ہوا۔ اُس کا نظریہ یہ تھا کہ — نفسیاتی پیچیدگیاں ابتدائی دور کے جذباتی صدمات کا نتیجہ ہوتی ہیں، وہ دبی ہوئی صنفی توانائی کا اظہار ہیں:

.....Symptoms were caused by early trauma, and
were expressions of repressed sexual energy.

تاہم فرائڈ کی بعض تحقیقات سبق آموز ہیں۔ اُن میں سے ایک اُس کا یہ قول ہے کہ — زندگی کا ہر بحران امکانی طور پر انسانی شخصیت کے مثبت پہلو کو متحرک کرنے کا سبب بنتا ہے:

Every crisis is potentially a stimulus
to the positive side of the personality.

یہ فطرت کے نظام کا ایک اہم پہلو ہے۔ خدا کے تخلیقی نظام کے تحت، ایسا ہوتا ہے کہ انسان کی زندگی میں جب کوئی غیر مطلوب واقعہ پیش آتا ہے تو وہ ایک مطلوب نتیجے کا سبب بن جاتا ہے۔

اِس کے بعد آدمی کے اندر نیا شوق، نیا ولولہ اور نیا جذبۂ عمل پیدا ہوتا ہے۔ آدمی کا ذہن زیادہ بیدار ہو کر زیادہ بہتر منصوبہ بندی کرنے لگتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہر بحران آدمی کی زندگی میں ایک نیا امکان کھول دیتا ہے، ہر ناکامی آدمی کے لیے ایک نئی کامیابی کا سبب بن جاتی ہے۔

آدمی کو چاہئے کہ وہ کسی بھی صورت حال میں مایوس نہ ہو، وہ ہر رکاوٹ کو اپنے لیے ترقی کا نیا زینہ سمجھے، وہ مسئلہ (problem) کو ایک چیلنج سمجھے، نہ کہ صرف ایک مسئلہ۔ مسئلے کو صرف مسئلہ سمجھنا آدمی کو مایوسی کی طرف لے جاتا ہے، اور مسئلے کو چیلنج سمجھنا آدمی کے لیے نیا دروازہ کھولنے کا سبب بنتا ہے۔

انفرادی آداب، اجتماعی آداب

اگر آپ چند آدمی کے ساتھ کسی مقام پر بیٹھے ہیں۔ قریب کی مسجد سے اذان کی آواز آتی ہے۔ اذان کی آواز سن کر اگر آپ خاموشی کے ساتھ اٹھیں اور مسجد کی طرف تنہا روانہ ہوجائیں تو یہ انفرادی آداب کا معاملہ ہے۔ ایسے موقع پر اس طرح خاموشی کے ساتھ چلے جانے کی نوعیت دوسری ہے۔

اس کے برعکس، اگر آپ ایک ادارہ کے باقاعدہ رکن ہوں اور آپ کی یہ ذمہ داری ہو کہ آپ وہاں روزانہ وقت پر آئیں اور مقرر ذمہ داریوں کو پابندی کے ساتھ ادا کریں۔ اس دوسری صورت میں اگر آپ اپنے ادارے سے اچانک اٹھ کر بغیر کچھ کہے ہوئے روانہ ہوجائیں۔ بعد کو معلوم ہو کہ آپ اپنے کسی نجی کام سے 10 دن کے لئے چلے گئے تھے تو اس طریقہ کا تعلق اجتماعی آداب سے ہے۔ اور اجتماعی آداب کی نسبت سے یہ طریقہ سخت قابلِ اعتراض ہے۔

عام طور پر لوگ انفرادی آداب کے معاملہ میں کافی معلومات رکھتے ہیں، لیکن اجتماعی آداب کے معاملہ میں لوگوں کو بہت کم باتیں معلوم ہیں۔ انفرادی آداب کے بارے میں لوگوں کا شعور جتنا بیدار رہتا ہے، اجتماعی آداب کے بارے میں لوگ اتنا ہی زیادہ بے شعوری میں مبتلا ہیں۔

انفرادی آداب اور اجتماعی آداب میں یہ فرق ہے کہ انفرادی آداب ذاتی محرک کے تحت ہوتا ہے۔ ہر آدمی اپنی ذات کے بارے میں حساس ہوتا ہے، اِس لیے وہ انفرادی آداب کے معاملے کو جلد سمجھ لیتا ہے اور اس کو اپنی زندگی میں شامل کر لیتا ہے۔ لیکن اجتماعی آداب کا معاملہ اِس سے مختلف ہے۔

اجتماعی آداب کے معاملے میں آپ کو دوسروں کے احساسات کو جاننا ہوتا ہے، اجتماعی آداب کے معاملے میں آپ کو اپنے سے باہر کی دنیا کا لحاظ کرنا پڑتا ہے۔ اجتماعی آداب کے معاملے میں کسی انسان کو زیادہ حساس اور زیادہ باشعور ہونا چاہیے، ورنہ وہ اِس معاملے میں بے شعوری کا شکار ہوجائے گا اور ایسی غلطیاں کرے گا جو اجتماعی شریعت کے اعتبار سے قابلِ معافی نہیں۔

حرص، قناعت

یکم جون 2009 کو مسٹر ایس کے سیف الدین (مدراس) سے دہلی میں ملاقات ہوئی۔ انھوں نے نصیحت کے لئے کہا۔ میں نے ان کی ڈائری میں یہ الفاظ لکھے:

''پرسکون زندگی کا راز کم پر راضی ہونا ہے نہ کہ زیادہ کی تلاش میں رہنا۔ کم کی حد ہے لیکن زیادہ کی کوئی حد نہیں۔ اس لیے ایسا ہوتا ہے کہ کم پر راضی ہونے والے کو پرسکون زندگی ملتی ہے۔ لیکن زیادہ کی تلاش کرنے والا کبھی پرسکون زندگی حاصل نہیں کر پاتا''۔

مذہب کی اصطلاح (religious term) میں کم پر راضی ہونے کا نام قناعت ہے اور زیادہ کی تلاش میں رہنے کا نام حرص۔ انھیں دو لفظوں میں زندگی کی پوری کہانی چھپی ہوئی ہے۔ جو آدمی اس حقیقت کو جان لے، وہی عارف ہے۔ اور جو آدمی اس حقیقت سے بے خبر رہے، وہی وہ انسان ہے جس کو معرفت حاصل نہیں ہوئی۔

اصل یہ ہے کہ انسان کی خواہشیں لامحدود ہیں، لیکن موجودہ دنیا ہر اعتبار سے محدود ہے۔ محدود دنیا میں لامحدود خواہشات کی تکمیل نہیں ہوسکتی، اس لئے جو لوگ موجودہ دنیا میں اپنی خواہشات کو لامحدود طور پر پورا کرنا چاہیں، وہ ہمیشہ بے اطمینانی کا شکار رہیں گے۔

طلب اور مطلوب کے درمیان فرق ہی کا نام بے اطمینانی ہے۔ جو لوگ اپنی طلب کو محدود نہ کریں، ان کے لئے یہی مقدر ہے کہ وہ ہمیشہ بے اطمینانی میں مبتلا رہیں اور اسی حال میں مر جائیں۔

ایسی حالت میں عقل مندی یہ ہے کہ آدمی حقیقت واقعہ کو تسلیم کرے، اور حرص کے طریقہ کو ناممکن سمجھ کر قناعت کے طریقہ کو اختیار کر لے۔ قناعت حقیقت پسندانہ رویہ کا دوسرا نام ہے، اور حرص غیر حقیقت پسندانہ رویہ کا دوسرا نام — قناعت کا طریقہ فطرت کے قانون سے موافقت کرنے کا نام ہے، اِس کے مقابلے میں، حرص فطرت کے قانون سے عدم موافقت کا نام۔

خیر خواہی یا بدخواہی

ایک باپ نے اپنی بیٹی کی شادی دور کے مقام پر کی۔ یہ بیٹی اپنے میکہ میں اس طرح رکھی گئی تھی کہ اس نے کبھی کوئی کام نہیں کیا۔ اس کے والدین کی کوشش ہمیشہ یہ ہوتی تھی کہ بیٹی خوش رہے۔ اس کو کوئی تکلیف نہ ہونے پائے۔ مگر باپ جانتا تھا کہ سسرال میں ایسا ہونے والا نہیں ہے۔ اس نے بیٹی کو رخصت کرتے ہوئے کہا کہ اب تم جہاں جارہی ہو، وہ تمھارے لئے ایک مختلف دنیا ہوگی۔ میکہ میں تم کو جو آرام ملا، سسرال میں تم اس کی امید نہ رکھنا۔

باپ نے اپنی سمجھ کے مطابق، یہ مشورہ خیر خواہی کے جذبہ کے تحت دیا۔ لیکن حقیقت کے اعتبار سے وہ بدخواہی کا مشورہ تھا۔ حقیقت کے اعتبار سے اس کا مطلب یہ تھا کہ ان کی بیٹی اپنے سسرال میں ہمیشہ منفی ذہن کے تحت رہے۔ وہ ہمیشہ احساسِ محرومی کا شکار رہے۔ وہ ہمیشہ یہ سمجھتی رہے کہ میرے میکہ کے لوگ بہت اچھے تھے اور میری سسرال کے لوگ بہت برے ہیں۔ میکہ والوں کے لئے اس کے دل میں جھوٹی محبت اور سسرال والوں کے لیے اس کے دل میں جھوٹی شکایت بھر جائے۔ ساری زندگی وہ اس احساس میں جئے کہ میری شادی غلط ہوگئی۔ وہ ہمیشہ میکہ والوں کو اچھا سمجھے اور سسرال والوں کو ہمیشہ برا سمجھتی رہے۔

موجودہ زمانے میں تقریباً ہر ماں باپ اپنی بیٹی کے حق میں اسی قسم کی فرضی خیر خواہی کرتے ہیں جو عملاً بیٹی کے لئے صرف ایک مستقل بدخواہی بن جاتی ہے۔ بیٹی اپنے میکہ کی کنڈیشننگ کی بنا پر خود سے کبھی اس معاملہ کو سمجھ نہیں پاتی۔ اور ماں باپ کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ اس کی کنڈیشننگ کو مزید پختہ کر دیتے ہیں، وہ اس کی کنڈیشننگ کا خاتمہ نہیں کرتے۔

صحیح یہ ہے کہ باپ یا تو اپنی بیٹی کے ساتھ لاڈ پیار (pampering) کا سلوک نہ کرے، یا کم از کم یہ کرے کہ وہ اپنی بیٹی سے بوقتِ رخصت کہہ دے کہ ہم نے جو کچھ کیا، وہ غیر فطری طریقہ تھا، فطری طریقہ وہی ہے جس سے تم کو سسرال میں سابقہ پیش آئے گا۔

سوال وجواب

سوال

عرض یہ ہے کہ ایک بار میں دہلی میں آپ کے پاس آیا تھا۔ اُس وقت آپ نے مجھ کو یہ حدیث سنائی تھی: مَنْ صَمَتَ نَجَا۔ یعنی جو چپ رہا اور جس نے بولنے سے پہلے سوچا، وہ کامیاب رہا۔ آپ نے میری ڈائری میں لکھوایا تھا کہ اِس حدیث کو مضبوطی سے پکڑ لیں اور اس کے مطابق اپنی زندگی بنائیں تو آپ کامیاب رہیں گے۔ عرض یہ ہے کہ اِس حدیث کے مطابق، زندگی بنانے کا مطلب کیا ہے، براہِ کرم، مطلع فرمائیں۔ (جواد الحق مظاہری، ہری دوار)

جواب

اِس حدیث میں چپ رہنے کا مطلب کامل معنوں میں چپ رہنا نہیں ہے، بلکہ اس کا مطلب ہے کم بولنا۔ جو آدمی کم بولے، اس کو بیک وقت دو فائدے حاصل ہوتے ہیں — ایک، یہ کہ وہ زیادہ سوچتا ہے۔ کم بولنے کا دوسرا پہلو زیادہ سوچنا ہے۔ جب آدمی بولتا ہے تو اُس وقت وہ سوچ نہیں پاتا۔ اِسی لیے کسی نے بالکل درست طور پر کہا ہے:

When I am speaking, I am not thinking.

کم بولنے کا دوسرا فائدہ یہ ہے کہ آدمی کو یہ موقع ملتا ہے کہ وہ دوسروں کی بات سنے، وہ دوسروں سے سیکھے، وہ دوسروں کے تجربات سے فائدہ اٹھائے۔ حقیقت یہ ہے کہ کم بولنا کوئی سادہ بات نہیں۔ کم بولنا پورے معنوں میں، ایک طریقِ زندگی ہے۔ جو آدمی کم بولنے کے طریقِ زندگی کو اختیار کرے، وہ ضرور اعلیٰ کامیابی حاصل کرے گا۔

سوال

آپ کی باتیں بہت اچھی ہیں، مگر اس وجہ سے نہیں کہ آپ اعمال کو آخرت کے ساتھ جوڑتے ہیں، بلکہ اس لیے کہ ان کی افادیت اِسی دنیا میں ہے۔ آخرت سے متعلق تمام تر باتیں ظنی ہیں اور وہ صرف ظنی ہی ہوسکتی ہیں۔ آخرت کو قطعیت کے ساتھ ثابت ہی نہیں کیا جاسکتا۔ مثلاً حدیث میں ہے کہ

میری امت کے 73 فرقے ہوں گے جن میں سے صرف ایک حق پر ہوگا اور باقی گمراہ۔ ظاہر ہے کہ کوئی بھی عالمِ دین روئے زمین پر ایسا نہیں ہے جو مذکورہ 72 گمراہ فرقوں کی تعیین کر سکے، اور جب آپ تعیین کی قدرت نہیں رکھتے ہیں تو آپ کا علم ظنی سے بھی نچلی سطح پر آجاتا ہے۔ نیز قیامت آنے سے پہلے ہی آپ یعنی علماء 72 کے عدد کو پار کر چکے ہیں، پھر مزید کتنے فرقے وجود میں آنے باقی ہیں۔ اس طرح پورا معاملہ ہی گڈمڈ ہو جاتا ہے۔ علم وہ ہے جو حتمی ہو، جو تبدیلی کو نہ چاہتا ہو، جو پتھر کی لکیر ہو۔ آج کچھ کہا، کل کچھ کہیں گے، یہ کوئی علم نہیں (خط میں نام درج نہیں، پونہ)۔

جواب

1- خالص سائنسی اعتبار سے دیکھا جائے تو اِس دنیا میں تمام علوم ''ظنی'' ہیں۔ سائنس کے مطابق، اِس دنیا میں ہماری واقفیت صرف امکان (probability) تک پہنچ سکتی ہے، نہ کہ حتمیت (certainty) تک۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ انسان کو صرف علمِ قلیل (الإسراء: 85) دیا گیا ہے۔ موجودہ زمانے میں سائنس کا بھی یہی موقف ہے۔ اِس موقف کو علمی نقطۂ نظر کہا جاسکتا ہے۔ اس کے سوا علمی طور پر کوئی اور نقطۂ نظر موجودہ دنیا میں ممکن نہیں۔

2- حدیث میں مذکورہ 72 فرقوں کو نام بنام متعین کرنا، یا یہ متعین کرنا کہ اِن میں سے کون سا فرقہ برسرِ حق فرقہ ہے، یہ صرف خدا کا کام ہے، یہ انسان کا کام نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو بات فرمائی ہے، وہ گم راہی کی نشان دہی کے اعتبار سے ہے، نہ کہ گم راہ فرقوں کی تعیین کے اعتبار سے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ اِس حدیث میں تفرّق یا فرقہ بندی کی شناعت سے متنبہ کیا گیا ہے۔ فرقوں کی تعداد بتانا اِس حدیث کا اصل موضوع نہیں۔

خبر نامہ اسلامی مرکز — 198

1- یکم ستمبر کے انقلاب کی یادگار کے طور پر لیبیا ایمبیسی کی طرف سے ایک پروگرام ہوا۔ یہ پروگرام یکم ستمبر 2009 کی شام کو نئی دہلی کے ہوٹل (Hayatt Regency Hotel) کے بال روم میں ہوا۔ اس کی دعوت پر سی پی ایس کی ٹیم کے تین افراد ان اس میں شرکت کی۔ یہاں مختلف ممالک کے سفرا اور اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد موجود تھے۔ انھوں نے ان کو قرآن کا انگریزی ترجمہ اور دعوتی لٹریچر دیا۔

2- پازیٹیو تھنکرس فورم (بنگلور) کے تعاون سے گل برگہ (کرناٹک) کے حلقۂ الرسالہ سے وابستہ افراد نے ستمبر 2009 میں چند دعوتی پروگرام کئے۔ یہ پروگرام گل برگہ کے حسب ذیل مقامات پر کئے گئے— فنکشن ہال، میڈیل کالج، کمپیوٹر کالج، انجینئرنگ کالج، آیورویدک کالج۔ اِس موقع پر انھوں نے وہاں کے اعلیٰ تعلیم یافتہ غیر مسلم حضرات سے دعوتی خطاب کیا اور بڑے پیمانے پر حاضرین کو قرآن کا انگریزی ترجمہ مطالعے کے لیے دیا۔

3- کمیونٹی آف سینٹ ایجی ڈیو (اٹلی) کے سالانہ پروگرام کے طور پر پولینڈ کے شہر کریکو (Cracow) میں 6-8 ستمبر 2009 کو ایک انٹرنیشنل کانفرنس ہوئی۔ اِس میں مختلف مذاہب کے نمائندے شریک ہوئے۔ عرب علماء بھی اس میں قابل ذکر تعداد میں موجود تھے۔ اِس اجتماع کا موضوع عالمی امن تھا۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز کے ساتھ سی پی ایس کے چار افراد نے اس میں شرکت کی۔ اِس موقع پر قرآن کا انگریزی ترجمہ بڑی تعداد میں کانفرنس کے شرکا اور پولینڈ کے مقامی لوگوں کو دیا گیا۔ اِس سفر کی روداد ان شاء اللہ سفرنامے کے تحت شائع کر دی جائے گی۔

4- بعد سلام عرض ہے کہ ناچیز کو آپ کا بھیجا ہوا ماہ نامہ الرسالہ پابندی کے ساتھ موصول ہو رہا ہے۔ میں اس کو ایک ہی نشست میں پڑھ لیتا ہوں۔ بلاشبہہ الرسالہ سے ہمیں جو رہنمائی ملتی ہے، اس کی کہیں نظیر نہیں۔ ماہ نامہ کے ہر صفحے میں ایک حیرت انگیز اور ایمان افروز سبق ہر مومن کے لیے موجود ہوتا ہے۔ یقیناً پوری دنیا کے مسلمانوں کے لئے اصلاحی اور ذہنی تعمیر کا یہ ایک واحد ذریعہ ہے۔ میں اس دعوتی مشن چلانے والے عالم کو لاکھوں سلام کرتا ہوں اور جب تک حیات باقی رہے گی، ان کے لیے دعا کرتا رہوں گا۔ میری دیرینہ خواہش ہے کہ آپ کے ہفتہ وار کلاس میں کبھی شرکت کروں۔ میں آپ کا اپنا ہندستانی فوجی ہوں۔ اس وقت دہلی چھاؤنی میں مقیم ہوں۔ خدا کے فضل سے پروموشن کے مقابلاتی امتحان میں کامیاب ہو گیا ہوں۔ مستقبل قریب میں چند ماہ کے cadre course میں جاؤں گا، پھر warrant officer کے رینک لگ جائیں گے۔ گھر کے سب خورد و کلاں آپ کو سلام عرض کرتے ہیں۔ (محمد آفاق عالم، دہلی چھاؤنی)

5- الرسالہ جولائی 2009ء کا شمارہ دیکھا۔ یہ شمارہ گجرات کے سفرنامہ پر مشتمل ہے جو بصیرت افروز ہے۔ اس شمارے کی خاص بات مولانا محمد ذکوان ندوی کی تحریر ''تاثراتِ سفر'' ہے، جو مجھے بہت خوب لگی اور اس کی ہر بات میرے قلب و ذہن میں اُتر گئی ہے۔ میں نے اِس تحریر کو تین بار پڑھا۔ میرے لئے یہ تحریر اس وجہ سے بہت زیادہ اہمیت

کی حامل ہے کیوں کہ بعض لوگ عموماً یہ تاثر دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ الرسالہ کوئی علمی پرچہ نہیں ہے، اس کی ہر تحریر میں اکابرین پر تنقید ہوتی ہے جس کی وجہ سے علماء اس کو قابل اعتنا نہیں سمجھتے۔ مگر یہ بصیرت افروز تحریر اُن کے اِس مغالطہ انگیز پروپیگنڈے کی مکمل تردید ہے۔ اِس تحریر سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ علم کے یہاں الرسالہ اور خود حضرت مولانا کی کیا قدر و منزلت ہے اور وہ مولانا کی تحریروں سے کس قدر استفادہ کر رہے ہیں۔ ندوۃ العلماء لکھنؤ سے فارغ علماء پورے عالم اسلام میں معتبر اور اعتدال پسند مانے جاتے ہیں اور جب ندوہ میں علماء اور اساتذہ کا الرسالہ کے تئیں یہ حال ہو تو یہ اِس بات کو سمجھنے کے لیے کافی ہے کہ دوسرے علماء بھی الرسالہ کو بڑے ذوق وشوق سے پڑھتے اور اس سے استفادہ کرتے ہوں گے۔ اس تحریر کے مطالعہ کے بعد مجھ کو مولانا عبدالباری ندوی کی اِس بات سے مکمل اتفاق ہو گیا ہے کہ ''مولانا وحیدالدین خاں جدید طبقہ کی طرف مبعوث ہیں'' بلاشبہہ یہ بات سو فی صد درست ہے۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ عالم اسلام کی شہرت یافتہ شخصیت حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی بھی الرسالہ اور مولانا وحیدالدین خاں صاحب کی علمی وفکری صلاحیتوں کے معترف تھے اور وہ اس سلسلہ میں مثبت رائے رکھتے تھے۔ الرسالہ ستمبر 1995 ''یکساں سول کوڈ'' کے عنوان سے خصوصی شمارے کے طور پر شائع ہوا تو اس شمارے کے حوالے سے ہندوستان کی اہم شخصیات کے متعدد خطوط الرسالہ، اپریل 1996 میں شائع ہوئے تھے جو پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں اور جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ الرسالہ کوئی عام پرچہ نہیں ہے، بلکہ یہ اپنی نوعیت کا واحد پرچہ ہے اور ہر اعتبار سے اہلِ علم کی خصوصی توجہ کا باعث اور استفادہ کے لائق ہے۔ چناں چہ ان اہم خطوط میں سے یہاں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے خط کا ایک حصہ نقل کیا جاتا ہے جس سے الرسالہ کی اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے:

'' فاضل گرامی ومحبّ سامی، مولانا وحیدالدین خاں صاحب وفقہ اللہ لما یحب ویرضیٰ، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ اُمید ہے کہ مزاج بخیر ہوگا۔ الرسالہ بابت ستمبر 1995 چند دن ہوئے ملا۔ اس میں آپ کا فاضلانہ مضمون '' یکساں سول کوڈ'' مطالعہ میں آیا۔ ہمارے علم میں یہ پہلا فاضلانہ اور مبصرانہ مضمون ہے جس میں یونی فارم سول کوڈ کا عالمانہ، مبصرانہ جائزہ لیا گیا ہے، اور تقابلی مطالعہ، ماہرین فن اور قانون سازوں کے بیانات وتجزیہ کی روشنی میں اس کی سطحیت اور عدم ضرورت ثابت کی گئی ہے۔ آپ ہماری طرف سے اس پر دلی مبارک باد قبول فرمائیں۔ اگر اس کو الگ الرسالہ کی صورت میں شائع کر دیں اور اس کا انگریزی ترجمہ بھی شائع ہو جائے تو بہت مفید ہوگا۔ انگریزی ترجمہ ماہرین قانون اور سپریم کورٹ کے ججوں کو بھیجا جا سکتا ہے۔ اُمید ہے کہ آپ سنجیدگی سے اس پر غور فرمائیں گے اور عجلت سے کام لیں گے۔ ہم نے یہ نمبر محفوظ کر لیا ہے۔ وہ ایک مرجع اور ماخذ کی حیثیت سے کام دے گا۔ اُمید ہے کہ مزاج ہر طرح بعافیت ہوگا۔ والسلام، طالب دعا ابوالحسن علی ندوی، 20 اگست 1995''

کچھ لوگوں کو اس بات پر اشکال ہے کہ مولانا اپنے معاصر علماء کی علمی ودینی خدمات کا اعتراف نہیں کرتے ہیں اور اگر کسی معروف عالم دین کا انتقال ہو جائے تو وہ دو سطر بھی الرسالہ میں نہیں لکھتے، مگر یہ سرتا سر ایک بے بنیاد

بات اور صریح الزام ہے۔ اس الزام کے رد میں یہاں طوالت کے خوف سے میں دوبارہ اول الذکر شخصیت کی مثال پیش کرنا چاہوں گا۔ جب مولانا ابوالحسن علی ندوی کا 31 دسمبر 1999 کو انتقال ہوا تو مولانا وحید الدین خاں صاحب نے انتہائی عقیدت مندانہ انداز میں مولانا علی میاں صاحب کی دینی وملی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے ایک جامع اور مفصل تحریر ''صدی کی شخصیت'' کے عنوان سے لکھی تھی جو الرسالہ مارچ 2000ء کے شمارے میں شائع ہوئی تھی اور بعد میں یہی تحریر ندوۃ العلماء لکھنؤ سے شائع ہونے والے پندرہ روزہ ''تعمیر حیات'' کے خصوصی شمارہ ''مفکر اسلام نمبر'' (10 جولائی تا 25 اگست 2000ء) میں بھی شائع ہوئی تھی۔ سب سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ یہ تحریر عنوان اور مواد کے اعتبار سے مولانا ابوالحسن علی ندوی کے دینی وملی خدمات پر لکھی گئی تمام تحریروں پر بھاری تھی، حتی کہ خود اہلِ ندوہ کی تحریروں پر بھی۔ اس کے ایک ایک لفظ سے خلوص ومحبت اور قلبی تعلق کے موتی ٹپکتے تھے۔ یہاں اس تحریر کا ایک مختصر اقتباس بطور نمونہ ملاحظہ کیجئے:

''مولانا ابوالحسن علی ندوی ایک ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے۔ ان کے اندر بیک وقت مختلف اور متنوع خصوصیات موجود تھیں۔ مولانا سید مناظر احسن گیلانی نے کہا تھا کہ یورپ میں جو کام اکادمی کرتی ہے وہ ہمارے یہاں ایک آدمی کرتا ہے۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی اسی قول کا ایک زندہ نمونہ تھے۔ وہ ایک فرد تھے، مگر انھوں نے کئی اداروں کے برابر کام کیا'' (الرسالہ، مارچ 2000ء صفحہ 24)

''تاثرات سفر'' کے عنوان کے تحت لکھی گئی زیر نظر تحریر نے جو نہایت اہم معلومات فراہم کی ہے، وہ یہ ہے کہ اہل علم حضرات مولانا کی تحریروں خاص طور پر الرسالہ کو بڑی پابندی سے استفادہ کی غرض سے پڑھتے ہیں۔ اور اس سچائی کو، خواہ وہ اس کا اظہار کریں یا نہ کریں اپنی جگہ تمام علماء یہ مانتے ہیں کہ مولانا فکری اعتبار سے موجودہ دور کے ممتاز اور مستند عالم دین اور قائد ملت ہیں اور انھوں نے جس طرح کی دینی، علمی، اصلاحی، تعمیری اور فکری خدمات انجام دیں اور اسلام کو از سرِ نو دریافت کے طور پر نئی نسل کے سامنے رکھا اور اسے یہ احساس دلایا کہ اسلام کوئی فرسودہ اور ناقابلِ عمل مذہب نہیں ہے، بلکہ یہ بالکل آج کی چیز ہے، وہ صرف انھیں کا حصہ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ مولانا نے اس سلسلے میں عصری اسلوب میں ایسا طاقت ور لٹریچر تیار کیا ہے جو ہر اعتبار سے قابلِ استفادہ اور آنے والے علماء کے لئے دین کی تبلیغ کے سلسلے میں قابل تقلید نمونہ کی حیثیت رکھتا ہے (غلام نبی کشافی، سری نگر، کشمیر، 24 اگست 2009)۔

6- امریکا کی جیل میں اصلاحی کام کرنے والے ادارے کی طرف سے ایک خط موصول ہوا۔ ادارے کی فرمائش پر اُن کو قرآن کا انگریزی ترجمہ ہدیۃً بھیج دیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں ادارے کا خط درج ذیل ہے:

I volunteer at for the Philadelphia Prison Systems on State Road in Philadelphia, PA. Once a month I visit young teenagers from the age of 15-17. The majority of the young men I speak with say they are Muslims but do not have a Quran. I ordered (5) Qurans last week through Amazon

(The Holy Qurna ISBN 81-7808-141-6) and I saw that they came from www.goodwordbooks.com. I would like to order 25 more to give to the students I visit. Thank you (Sister Deborah Saunders, Philadelphia, USA)

7- امریکا سے ایک خط موصول ہوا۔ حسب فرمائش ان کے پتے پر قرآن کا انگریزی ترجمہ روانہ کر دیا گیا ہے۔ یہاں خط کا ایک حصہ نقل کیا جاتا ہے:

Do you have any materials for free to offer to Muslim inmates in prison? I am a prison chaplain at Marion Correctional Institution in Marion, NC. We have a large and devout Muslim community here. (Chaplain Sehested, Philadelphia, USA)

8- چیپلنس سروسز (امریکا) کی طرف سے قرآن کے انگریزی ترجمہ کے سلسلے میں ایک خط ملا۔ ادارے کو قرآن کی 200 کاپیاں ہدیۃً بھیج دی گئی ہیں۔ اِس سلسلے میں ادارے کے منیجر کا خط یہاں درج کیا جاتا ہے:

We received the 200 copies of the Quran translated by Maulana Wahiduddin Khan. Thank you so very much! we will certainly use these resources not only with our patients and their families, but also as a valuable source of information and healing to the chaplains and hospital staff. You have no idea how comforting it is to our Muslim patients to be able to give them a Quran for them to keep. And now, you have sent us enough Qurans to give to our patients at all three of the hospitals we serve in Berkeley and Oakland, California. Thank you again for your generosity, and may it return to you tenfold! (Karla Droste, office manager, Chaplaincy Services)